نومبر، دسمبر ۸۲
1983/۱۴۰۳
۲۱

ماہنامہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

المبشر

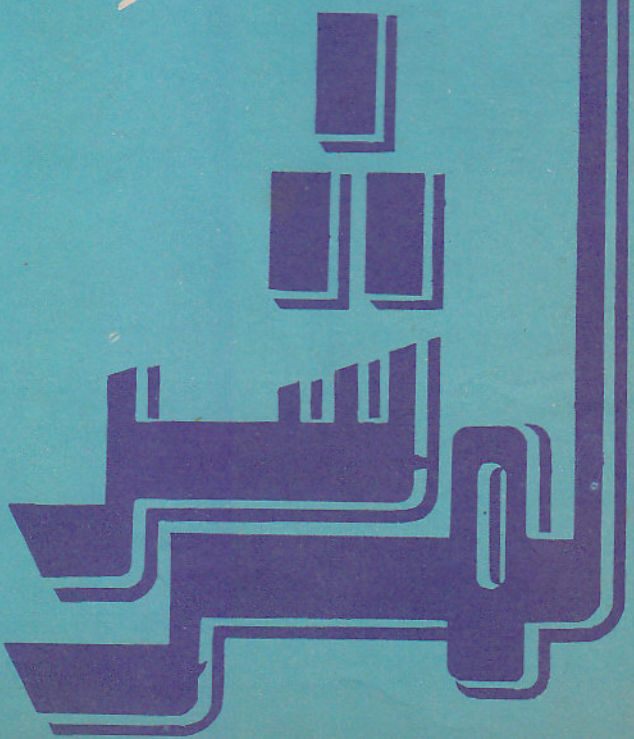

جلد نمبر ۴ شمارہ ۱ و ۲
محرم و صفر ۱۴۰۳ھ مطابق نومبر و دسمبر ۱۹۸۲ء

- سرپرست اعلیٰ
حضرت العلام مولانا اللہ یار خان صاحب مدظلہ

- مدیر مسئول:
حافظ عبدالرزاق ایم اے
عربی اسلامیات

- مجلس ادارت (اعزازی)
پروفیسر بنیاد حسین نقوی
بی اے (آنرز) ایم اے
مولانا محمد اکرم ملک منارہ
ضلع جہلم
پروفیسر باغ حسین کمال ایم اے

بدل اشتراک

زر سالانہ ۲۵ روپے
ششماہی ۱۸ "
فی کاپی ۲ "

سول ایجنٹ
مدنی کتب خانہ
گنپت روڈ لاہور

مذہبی دینی اخلاقی اور علم سلوک و تصوف کا مجلہ

اس شمارہ میں

- اداریہ — مدیر
- اسرار التنزیل — مولانا محمد اکرم منارہ
- احادیث نبوی — حافظ عبدالرزاق ایم اے
- باتیں ان کی خوشبو خوشبو — حضرت استاذ المکرم منارہ
- اصلاح نفس — مولانا عبدالغفور عباسی مدنی
- حسیں و سادہ و رنگیں ہے ۔۔۔ — پروفیسر محمد غلام (رہتوں)
- رسول اکرمؐ کی روحانی میراث — پروفیسر باغ حسین کمال
- آزادی کا المیہ — ابوسعید
- خدایا ایں کرم بار دگر کن — حافظ عبدالرزاق ایم اے چکوال

ماہنامہ المرشد چکوال (جہلم) پاکستان

رابطہ دارالعرفان۔ منارہ (جہلم)

حافظ عبدالرزاق پبلشر نے منہاج الدین پرنٹرز اصلاحی شرکت پرنٹنگ پریس گنپت روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ المرشد الحسنات منزل چکوال جہلم سے شائع کیا

اداریہ

کہتے ہیں انسان عجیب مجموعہ اضداد مخلوق ہے۔ اور کہنے والے اپنے اپنے رنگ میں ثبوت بھی پیش کرتے ہیں۔ اطباء کی نگاہ انسانی جسم کے اجزائے ترکیبی پر پڑی اور مٹی پانی آگ اور ہوا کے اس مجموعہ کو مجموعۂ اضداد کہہ دیا۔ پھر جسم اور روح کا جمع ہونا اس ثبوت کو وزنی بنا دیتا ہے ——— علمائے اخلاق نے انسان کی عادات و خصائل پر توجہ کی اور اس میں فضائل بھی نظر آئے اور رذائل بھی سامنے آ گئے انھوں نے بڑے وثوق سے کہہ دیا۔ انسان مجموعہ اضداد ہے۔

سیاسیین اور فلاسفر نے انسان کی معاشرت اور تمدن پر غور کیا تو دیکھا کہ انسان کو مختلف حالات پیش آیا کرتے ہیں۔ خوش کن بھی اور اندوہناک بھی۔ ابھی قہقہے لگا رہا تھا ابھی پھوٹ پھوٹ کے رونے لگ گیا۔ واقعی انسان مجموعۂ اضداد ہے۔ مگر اس کا ایسا ہونا فطری امر ہے۔ کیونکہ جس دنیا میں وہ رہتا بستا ہے وہ ہی مجموعۂ اضداد ہے۔ پھر ایسا کیوں نہ ہو۔ سردی گرمی، رات دن، نور ظلمت، بلندی پستی، سختی نرمی۔ تضاد ہی تضاد ہے۔ اس لئے اس تضاد کی آماجگاہ دنیا میں رہ کر انسان کو خوشی اور غم، دکھ اور سکھ، رنج و راحت، مصیبت اور عیش ہر قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مگر انسان کے حالات میں ایک اور عجیب تضاد پایا جاتا ہے۔ کہ کوئی خوشی ایسی نہیں جس میں غم کی آمیزش نہ ہو اور کوئی غم ایسا نہیں جس میں خوشی کا پہلو موجود نہ ہو۔ پہلی صورت تھوڑا سا غور کرنے سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ جو خوشی بھی ہوگی وقتی اور فانی ہوگی اس لئے عین خوشی کی حالت میں اس کے چلے جانے یا چھن جانے کا دھڑکا لگا رہے گا۔ مگر دوسری صورت آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتی کہ غم میں بھی خوشی کا پہلو موجود ہوتا ہے۔ یہ حقیقت سمجھنے کے لئے ایک خاص طرح کا انداز فکر ایک خاص قسم کا سوچنے کا ڈھنگ اور سلیقہ درکار ہے۔ اس انداز فکر کی بنیاد یہ ہے کہ اس جہان کی حیثیت کیا ہے؟ اس میں انسان کا مقصد تخلیق کیا ہے؟ اس کائنات کا نظام کیسے چل رہا ہے۔ اسے کون چلا رہا ہے؟ انسان کا اس کائنات کے ساتھ اور مدبر کائنات کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ انسان اس نہج پر سوچنا شروع کرتے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ مدبر کائنات اس گتھی کو یوں سلجھا رہا ہے۔ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ۔ یعنی رب العالمین فرماتا ہے اے میرے رحمۃ للعالمین حبیب ان مصیبت زدہ بندوں کو بشارت دے دے جو مصیبت آنے پر دل سے پکار اٹھتے ہیں کہ ہم اسی کے ہیں اور لوٹ کے اسی کے پاس جانا ہے ——— بلکہ محبوب کے پاس لوٹ کے جانے کا خیال ایسا کیف آفریں ہے کہ انسان سب سے بڑی مصیبت یعنی موت کے متعلق بھی کہہ اٹھتا ہے۔ الموت جسر یوصل الحبیب الی الحبیب یعنی موت ایک پل ہے جو دوست کو دوست سے ملا دیتی ہے۔ بلکہ وجد میں آکر کہہ اٹھتا ہے ؎ کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ؎ ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

یہ تو اہل مصیبت کا رویہ ہوا بشارت کس بات کی ہے جس کا اتنا اہتمام کیا گیا کہ بشارت دینے والا رب العالمین اور بشارت سنانے والا رحمۃ للعالمین۔ تو بشارت اس بات کی ہے کہ تم نے مصیبت میں صبر کیا۔ صبر کیا ہے؟ یہی نا کہ مصیبت

آنے پر نہ گلہ نہ شکوہ، نہ ہائے وائے نہ واویلا۔ اس لئے تمہارا رب تم سے راضی ہے خوش ہے تم اسکی رحمت کے مستحق ہو بلکہ مختصر بات یہ کہ انسان بن کر زندہ رہنے کا راستہ یہی تو ہے۔ جو تم نے اختیار کیا۔

لیجیئے اب کسے شک ہو سکتا ہے کہ عین غم کے اندر بھی خوشی کا پہلو موجود ہوتا ہے۔ اگر سوچنے کا انداز نہ نہ ہو جب بھی خالص مادہ پرستانہ ذہنیت کے لئے ایسے مواقع سامنے آجاتے ہیں۔ مثلاً ایک آدمی کے پاؤں میں ناسور ہے ڈاکٹر کہتا ہے ٹانگ کاٹنی پڑے گی۔ بیمار کے لیے اس ٹانگ کٹوانے کے عمل میں غم اور خوشی دونوں کی موجودگی کا کون انکار کر سکتا ہے ــــ انسان اور اس جہان رنگ و بو کی اس فطرت کو سامنے رکھیں تو یہ مہینہ ان دونوں کیفیتوں کا آئینہ دار نظر آتا ہے ــــ محرم الحرام اسلامی سال کا پہلا مہینہ ہے۔ یعنی اسکی پہلی صبح اس امر کا پیغام ہے۔ کہ اللہ کا شکر ہے۔ سابقہ سال بخیر و خوبی گزر گیا۔ نیا سال نئے جذبہ کے ساتھ اللہ کی اطاعت اور مخلوق سے شفقت کا عہد کرو۔ دیکھو سال گذشتہ کس عہدگی سے انجام پذیر ہوا۔ اللہ کے ایک بندے کو اللہ نے طرح طرح کی آزمائشوں میں ڈالا وہ ہر آزمائش میں پورا اترا۔ ہر امتحان میں کامیاب ہوا۔ اسکی کامیابی پر رب جلیل بھی خوش ہوا اور اسے اپنا خلیل بنالیا اور اللہ کا خلیل بھی خوش ہوا اور خلیل سے قیامت تک جس شخص کا تعلق ہوگا۔ وہ اسکی کامیابی پر خوش ہوگا۔ اور فطری بات ہے۔ کہ کسی کی کامیابی پر اس کے دوست خیر خواہ خوش ہوتے ہیں۔ اور بدخواہ سخت رنجیدہ ہوتے ہیں اور چیختے ہیں کہ ہائے وہ کیوں کامیاب ہوگیا بہرحال اسکے ایک امتحان کی یاد منانے کو رب جلیل نے قیامت تک آنے والے لوگوں کے لئے ایک ایسی عبادت قرار دے دیا کہ اگر وہ صحیح جذبے اور پورے آداب سے کی جائے تو انسان کی مکمل تطہیر (دھلائی) ہو جاتی ہے۔

ہمارے لئے شکر کا مقام ہے کہ المرشد اپنے تین سال مکمل کر چکا۔ اور اس شمارہ سے چوتھا سال شروع ہے المرشد کے اپنی بنیادی پالیسی کے اعتبار سے دو پیغام تھے اور ہیں کہ الطاعۃ لامر اللہ والشفقۃ علی خلق اللہ یعنی اللہ کی بندگی اور مخلوق سے شفقت ہم نے بساط بھر اس مقصد سے پوری لگن کے ساتھ کام کیا اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہماری یہ ناقص سی کوشش قبول فرمائے قارئین کرام اگر اس کے اندر افادیت محسوس کرتے ہیں تو ہمارے حق میں دعا کر دیں اور المرشد کو بہتر بنانے کیلئے مفید تجاویز سے نوازیں ــــ اس مہینے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس میں اسلام کی دو ایسی جلیل القدر ہستیاں یہود کی سازش کا شکار ہوئیں جو ہر لحاظ سے اسلام اور مسلمانوں کیلئے قابل قدر اور قابل احترام تھیں یعنی پہلی محرم کو خلیفہ ثانی عمر فاروقؓ نے جام شہادت نوش فرمایا۔ اور دسویں محرم کو نواسہ رسول حضرت حسینؓ نے کربلا کے میدان میں ان لوگوں کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا جنھوں نے ہزاروں خطوط لکھ کر بلایا تھا ؎ بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن ؛ خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

اللہ تعالیٰ ان پر کروڑ کروڑ رحمت بھیجے جس مقصد کیلئے ان حضرات نے جان دی ملت نے وہ مقصد تو یکسر بھلا دیا ہے ہاں اپنی انا کی تشکیل کیلئے بہت کچھ کر لیتی ہے ؎

چہ گویمت ز مسلمانِ نا مسلمانے ؛ جزایں کہ پور خلیل است و آذری داند

(مدیر)

اسرار التنزیل

مولانا محمد اکرم مناروی

(مسلسل)

ذکر الٰہی کی کیفیت

بزرگان محترم اور احباب کرام! کل بات یہ چل رہی تھی کہ دل میں گرمی اور وجود کی ایک خاص کیفیت سے ذکر موثر بنتا ہے قبولیت انوارات کے لیے خون میں ایک خاص حدت اور وجود میں خاص کیفیت کا ہونا ضروری ہے۔ اس کے بغیر استعداد قبولیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسی بات کو آگے بڑھاتے ہیں جتنا بھی مخلوق میں سے کسی کو منازل قرب اللہ کریم سے حاصل ہو سکتی ہیں ان کا واسطہ اور ذریعہ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، کل کی بات تو یہ تھی کہ ذکر زور سے کیوں کیا جاتا ہے اور سانس تیزی سے کیوں لی جاتی ہے، اور طریقہ قبولیت انوار کیا ہے، اور اس کے لیے کیا امور ضروری ہیں۔

آج میں یہ عرض کروں گا کہ یہ انوارات آتے کہاں سے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکلف مخلوق کے لیے دو طرح سے واسطہ اور ذریعہ ہیں ایک تو آپ کی ذات گرامی پر ایمان لانے سے آپ کے ساتھ ایک خاص تعلق پیدا ہو جاتا ہے اور اس تعلق کی کیفیت یہ ہے کہ اللہ کریم نور بصیرت دے تو جس کے دل میں رائی برابر بھی ایمان ہو انتہائی باریک سی تار قلب اطہر رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے نکل کر اس کے دل تک پہنچتی دکھائی دیتی ہے، یہ تعلق ہوتا ہے ایمان کا اور اگر وہ نبی کو نہ مانے تو خدا کو ماننا اس کے بس کی بات ہی نہیں، اس لئے کہ خدا تک پہنچنے کا ذریعہ اور وسیلہ ہی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں بلکہ فقہاء لکھتے ہیں کہ جب بچے کو تصور دیا جائے کہ میں اللہ کو مانتا ہوں، میرا وہ خالق، مالک اور رزاق ہے تو ساتھ ہی یہ تعیین کی جائے کہ میں اس اللہ کو مانتا ہوں جس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا جو مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے اور جو ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے، اور جو اللہ کے آخری رسول ہیں جس خدا کو وہ مانتے یا منواتے ہیں میں اس خدا کو مانتا ہوں ورنہ دنیا میں لوگوں نے خدا کے لیے ہزاروں تعریفیں بنا رکھی ہیں جن میں انبیاء کی تعریف کے بغیر کوئی سی تعریف بھی تسلیم نہیں کی جا سکتی۔

یوں تو ہر مذہب والے نے کوئی نہ کوئی تعریف، کوئی نہ کوئی طریقہ، کوئی نہ کوئی تعیین اپنی طرف سے مقرر کر رکھی ہے مگر ہمیں صرف اس خدا (اللہ) کو ماننا ہے جسکو محمد صلی اللہ علیہ وسلم تسلیم کرواتے ہیں اور وہی خدا ہے، باقی تمام تصورات اور محض تخیلاتی باتیں ہیں، سو تعلق باللہ کے لیے وہ نور ایمان بنیاد بنتا ہے جو مومن قلب اطہر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم فرماتا ہے قل لا تومنوا آپ ان سے کہدیجیے کہ تم ایمان نہیں لائے۔ ولکن قولوا اسلمنا

تم کہہ سکتے ہو کہ تم نے بات تسلیم کر لی ہے
ولما یدخل الایمان فی قلوبکم ، جب تک تمہارے دلوں
میں ایمان داخل نہ ہو، جب تک نورِ ایمان کی کوئی کرن قلبِ اطہرِ
رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دل میں نہ آئے تب تک ایمان
حاصل نہیں ہوتا ، محض مان لینا یا تسلیم کر لینا الگ بات
ہے ۔ تو یہ ہے نورِ ایمان ۔ اس میں قیام اور ترقی کا سبب
اعمال ہیں اگر مومن کے اعمال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد
کے مطابق ہیں اور وہ اتباعِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں محنت
کرتا ہے تو ہر ہر عمل اور ہر ہر قول ہر ہر فعل اس نور میں زیادتی کا
سبب بنتا چلا جاتا ہے خواہ تھوڑی زیادتی کا سبب بنے
یا زیادتی کا باعث ہو ۔ جس طرح کا عمل ہوگا ۔ فرض ہوگا ،
سنت ہوگا یا نفل ہوگا ، سنتِ عبادیہ یا عادیہ سے ہوگا یا امور
عادیہ یا عبادات سے ہوگا جس طرح کا فعل ہوگا وہ اس نورانیت
کو بڑھاتا چلا جائے گا چاہے ایک ریزہ ہی کیوں نہ بڑھائے
اور اگر ترکِ اعمال کرتا رہا یا ترکِ احکام ہوتا رہا یا اس کے
اعمال خلافِ سنت ہوتے چلے گئے تو اس نور میں سے
کوئی نہ کوئی ذرہ گھٹتا چلا جائے گا اور اگر یہ بڑھنا شروع ہو
جائے گا لہذا ایک ایک تار ملتے ملتے بہت موٹا مضبوط رسہ
بنتا چلا جاتا ہے اور اگر ٹوٹنا شروع ہو جائے تو ہم جنہیں
گناہ صغیرہ کہتے ہیں یا جن سنتوں کو ہم بڑا ہلکا اور سادا سا
معمولی تصور کرتے ہیں وہ معمولی نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم
کا کوئی فعل بھی عند اللہ معمولی نہیں ہماری نگاہ میں اسکی
اہمیت ہو نہ ہو اللہ کے نزدیک اس کی ایک
خاص اہمیت ہے اور مقام ہے جب ہم خلافِ سنت بات
یا کام کرتے ہیں تو اس تعلق میں سے کوئی نہ کوئی ذرہ گھٹ

گھٹتا ہے ، اور اگر آدمی مسلسل یونہی زندگی گزارتا چلا جائے
تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ گھٹتے گھٹتے ایک دن یہ تار ٹوٹ جاتی
ہے ، جب نورِ ایمانی کا یہ رابطہ ٹوٹ گیا تو وہ شخص آوارہ ہو
گیا ، اب مذاہبِ باطلہ میں سے اسے کوئی بھی اچک لیتا
ہے اور وہ اس کے ساتھ چل پڑتا ہے ، جو بھی پہلے پہنچ
گیا وہ اسی کے ساتھ چل نکلا ۔ آخر یہ لوگ جلدی جلدی کیوں
مذاہبِ باطلہ قبول کرتے ہیں اس لیئے کہ حقیقتاً وہ اپنے مذہب
سے بے گانہ ہو چکے ہیں ، کسی کا مذہب چھڑا کر اسے دوسرا
مذہب منوانا بہت مشکل بات ہے ایک پتھر کے پجاری کو پتھر
کی پوجا چھڑوا کر اللہ کی بارگاہ میں لانے کے لیئے بڑی محنت
درکار ہے آگ کا پجاری سولی پہ لٹکنا قبول کرے گا مگر
آگ کی پرستش سے باز نہیں آئے گا تو کیا وجہ ہے کہ ایک
مسلمان ، ایمان اور اللہ تعالےٰ اور رسول اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم کے ساتھ تعلق رکھنے والا ہر کس و ناکس کی بات
میں آکر کہیں سے کہیں چلا جاتا ہے وجہ یہ ہوتی ہے کہ جب
یہ تعلق کٹتا ہے تو وہ کسی خاص فرقے کے لیئے تیار نہیں ہوتا
بلکہ اس کی بدنصیبی سے جونسا فرقہ اس کے قریب پہنچ گیا
یا جس کے متعلق اس کے ذہن میں غلط سلط باتیں آگئیں
وہ اس طرف گر گیا ، یہی وجہ ہے کہ آج کل ساون کے مینڈکوں
کی طرح مذاہب سر نکال رہے ہیں ہر گھر میں اگر آدمی
تیرہ ہیں تو مذہب پندرہ ہیں باپ کا جدا ہے بیٹے کا جدا
ہے بہن کا جدا ہے ، بیوی بچوں کا خیال اور ہے اور میاں جی
کا خیال اور ہے ، ان سب کی وجہ یہ ہے کہ ان پتنگوں کی
ڈوریں کٹ گئی ہیں ۔

اب ایک تعلق ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلیم

کر لینے کا اور نورِ نبوت کو اپنے دل میں سمو لینے کا اور ایک تعلق ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبتِ اقدس کا جس تعلق نے صحابہ کرامؓ کو درجہ صحابیت سے سرفراز کیا وہ تعلق بغیر صحبت کے حاصل نہیں ہوتا اور صحبتِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تک تھی جب تک آپ اس دارِ فانی میں تشریف فرما تھے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہاں سے پردہ فرما گئے تو بعد میں آنے والے لوگوں یا ہم جیسے لوگوں کے لئے جو یہاں رہتے بستے ہیں صحبت کا حصول کیسے ممکن ہو؟

لہٰذا اللہ کریم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی احسان بھی منقطع نہیں کیا۔ ایک اصولی بات یاد رکھئے کہ جو فیض خدا نے مخلوق کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے پہنچایا اسے خدا نے ابدالآباد تک قائم رکھا ہے، آپؐ کا کوئی فیض منقطع نہیں ہوا، یہ فیضِ صحبت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قوی تر فیض ہے اور اگر یہی منقطع ہو گیا تو پھر باقی کیا بچا؛ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے تو صرف مومن بنا اور فیضِ صحبت کی جسے ایک نگاہ نصیب ہو گئی وہ درجۂ صحابیت کو پا گیا، یہ فیض اگر منقطع کر دیا گیا تو یوں سمجھو کہ عظیم حصہ نبوت خدا نے روک دیا۔ اور یہ ناممکن ہے، بلکہ محال ہے، یہ ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ آپؐ کی نبوت کائنات کے لیے ابدالآباد تک کے لیے ہے۔ اور آپؐ فیضِ صحبت کو اللہ کریم نے ان سینوں میں پہنچایا جنہیں صحبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حاصل ہوئی پھر ان لوگوں سے سینہ بسینہ ان لوگوں نے حاصل کی جنہیں ان کی صحبت نصیب ہوئی یہ ایک کیفی معاملہ تھا، یہ کیفیات تھیں اور کیفیات الفاظ میں نہیں ڈھل سکتیں کیفیات کتابوں میں نقل نہیں ہو سکتیں اور نہ ہی کیفیات پڑھائی جا سکتی ہیں بلکہ کیفیت کو تو صرف محسوس ہی کیا جا سکتا ہے اور یہ کیفیت قلوبِ صحابہؓ نے آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم سے اور تابعین نے صحابہؓ سے اخذ کی اب جب نورِ ایمان کے ساتھ صحبتِ صحابہ نصیب ہوئی تو وہ شخص تابعی بن گیا اور اسی طرح تبع تابعین کو یہ دولت نصیب ہوئی، صحبت کا فیض اخذ کرنے کے لیے نورِ ایمان بنیاد ہے اگر یہ نہیں ہو گا تو فیضِ صحبت بھی نصیب نہیں ہو سکے گا۔ جیسے میں نے کل عرض کیا تھا کہ کتنے لوگ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں رہتے بستے ہوئے بھی فیوضاتِ نبویؐ سے محروم رہے اس کی وجہ کیا تھی فیوضات نبویؐ میں تو کمی نہ تھی آپ نے کسی طرف سے اپنے فیض کو روکا نہ تھا بلکہ وجہ یہ تھی کہ وہ نورِ ایمانی جو اخذِ فیض کی بنیاد بنتا ہے انہیں نصیب نہ ہوا تو اصلی بنیاد نورِ ایمانی ہے جسے آپ صحتِ عقیدہ بھی کہہ سکتے ہیں عقیدہ درست نہیں ہو گا اور اس کی اصلاح نہیں ہو گی تو پھر اخذِ فیض مشکل ہے محال اور ناممکن ہے، صحتِ عقیدہ کے بعد جب اسے ان لوگوں کی صحبت نصیب ہو گی جو سینہ بسینہ اس فیض صحبت کو اخذ کر رہے ہیں تب جا کر اس کی تکمیل ہو گی۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اسے حقیقی معنوں میں مکمل تعلق اور ربط تبھی اسے حاصل ہو سکے گا اب چونکہ یہ کیفیت ہے اور اس کے حصول کے لیے ان حضرات کے پاس پہنچنا شرط ہے جو اس کیفیت کے امین ہوں اگر کسی کے اپنے سینے میں یہ نور نہ ہو تو وہ کہاں سے بانٹے گا اگر اس کا اپنا سینہ ان کیفیات سے خالی ہے تو وہ دوسروں کو کیفیات کہاں سے منتقل کرے گا۔ اس لئے یہ شرط

نہیں ہے کہ خواہ مخواہ کسی خاندانی پیر ہی کے پاس جائے
بلکہ شرط یہ ہے کہ خواہ کوئی ہو اس کے پاس یہ کیفیات
ہوں یا انوارات اور تجلیات ہوں یہ رابطہ اور تعلق ہو جب
یہ دونوں چیزیں میسر ہوں اور اگر ایسی ہستی میسر آ جائے
تو ست

چنیں مردے کہ یابی خاک او شو
اسیرِ حلقۂ فتراک او شو

اگر ایسی ہستی میسر آ جائے تو بڑی خوش نصیبی ہے دنیا
میں انسان پر اللہ کریم نے جس قدر نعمتیں بانٹی ہیں ان سب
میں سب سے بڑی نعمت نبوت ہے اور کسی شخص کے لیے
جس قدر دنیا میں انعامات ہو سکتے ہیں ان سب سے بڑا
انعام نورِ نبوت اور فیضانِ صحبتِ نبوی ہے، لہٰذا اگر ایسی
ہستی نصیب ہو جائے تو میرے خیال میں انعام بھی بہت
بڑا ہے اور امتحان بھی بڑا کٹھن جاتا ہے وہ شخص جو ان
حضرات کی حکایات اور قصے سن کر ان کی باتیں سنکر ان کی عقیدت
اور محبت دل میں لے کر زندگی بھر ان کو تلاش کرتا ہوا دنیا
سے چلا جاتا ہے، میرے خیال میں اس کی نجات کے لیے
اتنا ہی کافی ہے لیکن اگر کوئی شخص ان کو پائے اور پھر
تجاہل عارفانہ سے کام لیتا ہوا ان کے فیضان سے محروم
رہے اور پھر اس کے اور دنیاوی مصروفیات و امور کے
درمیان تعامل پیدا کر دے کہ یہ کام انجام دے لوں فرصت
ملے گی تو بھی یہ کروں گا — وہ کبھی نہیں کر سکے گا اور اس کے
پاس خدا کو جواب دینے کے لیے کوئی دلیل نہیں ہو گی
اور میدانِ حشر میں اس کے پاس کوئی جواب نہیں ہو گا
کیا یہ مناسب ہے کہ اللہ کریم کی بارگاہ میں کوئی یہ عذر پیش

کرے کہ اللہ! مجھے دوکان سے فرصت نہیں ملی ورنہ
میں ضرور نورِ نبوت اخذ کرتا، کیا یہ جواب صحیح ہو گا کہ کوئی کہہ
دے کہ گھر میں بیماری تھی ورنہ میں اس نعمت کو ضرور حاصل
کرتا، یا کوئی یہ بہانہ پیش کرے کہ میرا کھیتی باڑی کا کام
ختم ہو جاتا تو میں اس دولت کی طرف توجہ دیتا ان کاموں میں
سے کوئی بھی کام جب تک یہ دنیا قائم ہے ختم نہیں ہو گا کیونکہ
یہی کام کرنے کے ہیں اور انسان میں فضیلت یہی ہے
کہ ان سب امور کو انجام دے کر فیضانِ نبوت کو اخذ کرے
اسی لیے تو وہ منازلِ قرب پاتا ہے، ورنہ محض طاعت
تو فرشتہ اتنی کرتا ہے کہ کوئی انسان اس کے مقابلے میں کر
ہی نہیں سکتا لیکن اس کی اطاعت ان پابندیوں اور
حدود سے مبرا ہے، اسے نیند کی رکاوٹ ہے نہ بیوی بچوں
کا فکر ہے، نہ اسے دکان، مکان کی فکر ہے نہ اسے
کھیتی باڑی کا غم ہے صرف عبادت ہی عبادت ہے، جو
فرشتے تخلیق کائنات کے وقت تخلیق کیے گئے اور ہمیشہ
رہیں گے اگر اس وقت سے سجدے میں سر رکھے ہیں اور
ابدالآباد تک سجدے سے سر نہیں اٹھائیں گے تو ان کے
درجات میں ترقی نہیں ہو گی وما منا الا له مقام معلوم
جس رتبے پر ہیں اسی پر رہیں گے کیوں؟ اس لیے کہ انہوں
نے خداوندِ عالم کے لقاء کے لیے اپنی کسی ضرورت کو
قربان نہیں کیا، تو انسان جب یہ امید رکھے کہ میں فرشتوں
کی طرح تمام ضروریات سے بالاتر ہو جاؤں تو اس کی عبادت
بھی ویسی ہی ہو جائے گی، پھر عبادت میں کیا زور رہا اور اس
کی کیا قیمت اور وقعت رہی عبادت میں وزن اور قیمت
پیدا ہوتی ہے جب کائنات کے سارے بکھیڑوں کا شکار

کہہ کر قطع کر دیتا ہے کہ اللہ عظیم ہے، اللہ بڑا ہے اللہ کا حکم ہی مقدم ہے باقی سارے امور اس کے بعد تو میرے بھائی! اخذِ فیض کے لئے جس طرح سے طریق ذکر ضروری ہے اسی طرح اصلاحِ فکر سب سے پہلے ضروری ہے، دین کو دوسرے درجہ میں نہ رکھے دین ثانوی حیثیت قبول نہیں کرتا، دین محکوم بن کر نہیں حاکم بن کر رہتا ہے۔ اگر دین کو اپنے اوپر مسلط کرے گا دیندار رہے گا۔ اگر اپنی رائے کو دین پر مسلط کرے گا کبھی دین دار نہیں رہے گا، دین میں ایک خصوصیت ہے کہ یہ حاکم ہو کر رہتا ہے محکوم ہو کر کبھی نہیں رہتا اگر ہم اپنی پسند کو اس کے اوپر مسلط کریں گے اور اسے اپنے پروگراموں کے تابع کریں گے تو یہ دین ہو گا تو ہمیں اس کے تابع ہو کر چلنا پڑے گا اور ہمیں اس کی اطاعت کرنا ہو گی جس طرح سے اصلاح طریقِ ذکر ضروری ہے اس طرح سے اصلاحِ فکر اس سے مقدم ہے اور ان دونوں طرح کے انوارات کا اکتساب ضروری ہے، جب نورِ ایمان کے ساتھ نورِ فیضانِ صحبتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم حاصل ہو جاتا ہے تو یہ دونوں مل کر عرشِ الٰہی کا زینہ بن جاتے ہیں، آپ دیکھتے ہیں کہ وہاں ارواح بھی قدم نہیں رکھ سکیں جہاں وجود باجود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گیا، گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود مسعود میں وہ تجلیات و فیوضات موجود ہیں، جن سے فرشتوں کی ارواح بھی ناآشنا رہیں کہ سدرۃ المنتہیٰ سے آگے جبرئیل امین جیسا فرشتوں کا سردار بھی قدم نہ رکھ سکا لیکن وجود باجود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہاں تک تشریف لے گئے، جہاں تک میرے رب نے چاہا تو بالائے عرش تعلق پیدا کرنے کی قوت عظیم شے ہے اور وہ وجودِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بدرجہ اتم موجود تھی جب یہ تعلق قوی ہوتا ہے تو پھر روح میں قوتِ پرواز پیدا ہو جاتی ہے اور روح اپنی منزل کا نشان بھی بارگاہِ نبوی سے ہی پاتا ہے اور اسے ہی فنا فی الرسول کہتے ہیں کہ وجود دنیا کے کسی گوشے میں ہو روح آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی جو تیوں میں ہو اور وجود روح کے تابع ہوتا ہے فنا فی الرسول کی دلیل یہ ہے کہ جو بات وہاں پسند ہے وہ اس کے وجود سے ظاہر ہو اور جو بات وہاں ناپسند ہو اس سے اس کا وجود انکار کر دے، تب پتہ چلتا ہے کہ واقعی اس کی روح دربارِ نبوی میں باریاب ہے اور اگر یہ درجہ نصیب نہ ہو تو پھر فنا فی الرسول نہیں ہے اس لئے کہ اگر روح دربارِ نبوی میں حاضر ہو گی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہیڑ کر بھی کھلا کوئی حضور کی اداؤں کے خلاف کر سکتا ہے اور جب روح ہی کوئی کام نہیں کرتا تو وجود تو بغیر روح ایک بے جان شے ہے اس میں قوتِ عمل ہی کیا ہے یہ کب کرے گا اس بات سے میں آپ کو بد دل نہیں کر رہا، میں

یہ نہیں کہتا کہ اگر یہ حاصل نہ ہو تو اس کی طلب ہی چھوڑ دے طلب کا چھوڑنا مرد کا شیوہ نہیں وہ انسان ہی نہیں جو مقصد کی عظمت سے آگاہ ہو اور پھر اسے حاصل کرنے کی کوشش ہی ترک کر دے گویا اس نے انسانیت کی تذلیل کی قرآن کریم فرماتا ہے۔

اولئک کالانعام بل ھم اضل وہ تو چوپاؤں سے بھی گئے گزرے ہیں۔ سو انسان کو چاہیئے کہ وہ طلب میں لگا رہے لہذا فنافی الرسول کا معیار یہ ہے کہ اس بات کو ذہن نشین کرے کہ کوئی کام اس کے وجود سے خلافِ سنت محال ہو جائے وہ رک جائے وہاں وجود انکار کر دے کہ یہاں سے آگے نہیں بڑھوں اور اس کی دلیل یہ ہوگی کہ جب بارگاہِ نبوی ﷺ میں روح حاضر ہے تو وہ سامنے بیٹھ کر حضور کے خلاف پسند کوئی کام نہیں کرے گا۔ اور جب روح ہی نہیں کرے گا تو اکیلا وجود تو کر ہی نہیں سکتا یوں فنافی الرسول کے طفیل کامل اتباعِ سنت نصیب ہو جائے گا جب فنافی الرسول حاصل ہوتا ہے تو فیوضاتِ نبوی ﷺ بدرجہ اتم نصیب ہوتے ہیں پھر روح میں وہ فیض بھی عود کر آتا ہے جو وجود مسعود کو بالائے عرش لے گیا پھر وہ روح جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جوتیوں میں حاضر ہوتی ہے اس میں یہ قوت آ جاتی ہے کہ وہ ایک نگاہ میں لامکان کی بلندیوں کو چھو لے اور رفعتوں کو پالے اور قربِ الٰہی کی منازل کو اپنا آشیانہ بنالے

اگر یہ چیزیں حاصل نہ ہوں، ایک شخص اتباعِ سنت ہی چھوڑ دے اس کی زندگی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے خلاف ہو تو اس کے پیری فقیری کا دعویٰ کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ گویا اس کی روح روحِ اطہر محمد رسول اللہ سے لاتعلق ہے یا بارگاہِ نبوی ﷺ سے اس کی روح کا کوئی تعلق نہیں ہے اور جب روح کا تعلق بھی وہاں نہیں ہے تو پیری کس بات کی ہے لہذا یوں سمجھ آئی کہ جو لوگ خلافِ سنت زندگی بسر کرتے ہیں وہ بے چارے بھولے ہوئے ہیں ان کی حالت پر کہ یہ پیر ہے ہمیں کہیں پہنچا دیں گے یہ ابلہ فریبی ہے خود فریبی ہے، اپنے آپ کے ساتھ دھوکہ ہے اپنے آپ کے ساتھ فراڈ ہے یہ ضروری ہے کہ جس شخص کی روح وہاں حاضر ہوگی وہ خلافِ سنت امور سے رک جائے گا، خلافِ سنت کام صادر ہونا مشکل ہو جائے گا، تو میرے بھائی ایک طرح سے یہ اپنا بھی امتحان ہے اپنی جانچ اور معیار بھی ہے کہ خلافِ سنت فعل مجھے کتنا کڑوا لگتا ہے اگر تو وہ کڑوا اور تلخ محسوس ہوتا ہے کوئی بات ہے تعلق ہے اگر روح وہاں مقیم نہیں ہے تو کبھی وہاں جاتا ضرور ہے اور اگر اسے دوام حضور نصیب نہیں ہے تو وہ حضور نبوی ﷺ سے محروم بھی نہیں ہے، لیکن اگر کوئی شخص خلافِ سنت کام کرتا ہے اور اس کے دل کو ٹھیس نہیں

پہنچتی تو اس کی روح اس گلی سے نا آشنا ہے وہاں تک نہیں پہنچ سکا۔ وہاں تک نہیں جا سکا جہاں یہ اپنے جانچنے کا معیار ہے وہیں ان لوگوں کے پرکھنے کی کسوٹی بھی ہے جو پیری یا شخصیت کے مدعی ہیں، ان کو جانچنے کا معیار یہی ہے کہ ان کی روح کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت ہو گی تو ان کے وجود کو بھی خیر الانامؐ سے نسبت ہو گی اور اگر وجود کو نسبت نہیں ہے تو روح کو نسبت ہو ہی نہیں سکتی، سو میرے بھائی! جس طرح اخذِ فیض کے لیے طریق ذکر ضروری ہے اور اس پر عمل لازمی ہے اسی طرح اس سے پہلے یہ بنیاد ضروری ہے کہ پہلے عقیدے کو درست کرے مانا جائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی رطب ویابس کو نہ ملائے سنی سنائی پر اعتبار نہ کرے سیدھا براہِ راست تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رکھے اور ان حقائق کو اسی طرح مانے جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منوائے ہیں کیونکہ عقیدے کے بارے میں جو بات آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے اس میں تاویل جائز نہیں ہے، اگر تاویل کرے مانے گا تو ماننے والا نہیں ہے تاویل کرنے والا ہو گا مگر ماننے والا نہیں ہو گا۔ وہ مومن نہیں ہو گا عقائد میں تاویل درست نہیں ہے جو الفاظ جس کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں انہیں الفاظ کو بعینہٖ ماننا شرط ہے

جب عقیدے کی اصلاح ہو گی تو ایمان در آئے گا اور نورِ فیض صحبت کے لیے جگہ بنائے گا اور اس کو اخذ کرنے کی دل میں استعداد پیدا کرے گا پھر کوئی ایسی ہستی نصیب ہو جو نورِ فیض صحبت کی امین ہو، چونکہ یہ ایک کیفی معاملہ ہے اور کتابوں سے یہ کیفیات نہیں ملتیں تو پھر لازماً ایسی ہستی کی تلاش ہو گی جس کا سینہ فیوضاتِ نبویؐ کا گنجینہ ہو اور خوش قسمتی سے اگر ایسی ہستی مل جائے تو ساری کائنات کو قربان کر دے مگر اس کی صحبت نہ چھوڑے کہ دنیا میں اس کے مقابلہ میں کوئی دولت بھی نہیں، دنیا کیا دو جہانوں میں کوئی اتنی قیمتی نعمت نہیں ہے اس لیے کہ جنت میں جتنی بھی نعمتیں ہیں ان سب میں اعلیٰ اور قیمتی لقائے الٰہی ہے ساری لذتوں کا مدار اسی بڑی لذت پر ہے اسی کیفیت پر ہے جو دیدارِ باری لقائے باری اور قربِ الٰہی سے نصیب ہو گی اور دوزخ کی سب سے بڑی سزا یہ ہے کہ وہ لقائے باری سے محروم ہو جائے اگر دیدارِ باری جہنم میں نصیب ہوتا تو جہنم بھی جنت کا نمونہ بن جاتا دوزخی کی سب سے بڑی سزا یہ ہے کہ وہ لقائے باری سے محروم ہو گا قال اخسئوا ولا تکلمون ان پر پابندی لگ جائے گی کہ کبھی مجھے پکار بھی نہیں سکتے ہو کبھی میرا نام نہیں لے سکتے مجھ سے کبھی بات نہیں کر سکتے، لہٰذا اس دنیا میں اللہ کا نام لینا جنت نظیر ہے اور اللہ کے

نام سے محرومی خود کو دوزخ میں ڈالنے کے مترادف ہے، تو میرے بھائی جہاں ایسے حضرات کی صحبتیں برکات کا سبب بنتی ہیں وہاں یہ حساب کو سخت کر دیتی ہیں اور پھر جب بارگاہِ نبوی میں حاضری نصیب ہو جائے اور جیسے مشاہدات ہو جائیں اس کا دوسرے شخص کی نسبت محاسبہ بھی جداگانہ ہوگا ایک شخص چودہ سو سال بعد ما و شما سے یہ سنتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اس طرح قبر میں عذاب و ثواب ہوگا اور ایک شخص کو اللہ تعالیٰ بصیرت عطا کرتا ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ قبر میں اس طرح عذاب و ثواب ہو رہا ہے میدانِ حشر میں دونوں کی حالت جداگانہ ہوگی اس سے سوال و جواب ہلکے ہوں گے اس نے سن کر اعتبار کیا اور دوسرے سے شدید ہوں گے کہ تم نے دیکھا مگر عمل نہ کیا جہاں یہ نعمت بہت عظمت کی حامل ہے وہاں اس کے ساتھ ہی بڑی ذمہ داری بھی ہے اور اس پر امانت کا اتنا ہی بڑا بوجھ بھی ہے کیا یہ سب کچھ دیکھ کر کوئی دنیا کے امور کو آخرت کے امور پر مقدم کر سکتا ہے؟ لا تحرک ذرۃ الا باذن اللہ اس نظام عالم میں مجھے دخل ہے نہ آپ کو، بارش کو نہ میں روک سکتا ہوں نہ آپ اسے برسنے کا حکم دے سکتے ہیں یہ اللہ کریم کا ایک مبسوط نظام ہے لوگ بیمار ہوں گے اور صحت یاب بھی پیدا ہوں گے اور دنیا سے چلے بھی جائیں گے، میں پچھلے دنوں "الحق" رسالہ دیکھ رہا تھا اس میں مولانا غلام غوث ہزاروی کا ایک واقعہ تھا کہ ان کا ایک ہی بچہ تھا اس کے بعد اولادِ نرینہ سے محروم ہی رہے ایک ہی لڑکا تھا اور وہ بیمار تھا بالاکوٹ میں قادیانیوں نے مسلمانوں سے مقابلہ رکھ دیا حضرت کا بچہ سخت بیمار تھا سب نے منع کیا کہ تشریف نہ لے جائیں یہ بے چارا پتہ نہیں بچے گا بھی یا نہیں فرمانے لگے اس کو بچانا یا نہ بچانا میرے بس ہی نہیں ہے لیکن مناظرہ کرنے کی قوت اللہ نے مجھے دے رکھی تو جو کام اس نے میرے ذمہ لگایا میں وہ چھوڑ دوں اور جو اللہ کا اپنا کام ہے میں اس کے لئے بیٹھ جاؤں؟ سو اگر یہ فوت ہو جائے تو اسے دفن کر دینا میں باطل کے مقابلہ کے لئے ضرور جاؤں گا اور وہی ہوا وہ وہاں مناظرہ کرتے رہے اور یہ یہاں اللہ کو پیارا ہو کر دفن ہو گیا لیکن اس شخص نے دین کا کام نہ چھوڑا ساری زندگی میں کچھ بھی کرتا اس کی نجات کے لئے یہ بات بھی کافی ہے تو یہاں اگر اخذِ فیض کی تمنا ہے تو ایثار کرنا سیکھ۔ اپنی رائے کو حصولِ فیض کی کوششوں کے تابع کر دو جو لمحہ جو گھڑی جو آن، نصیب ہوتی ہے وہ حاصل کر لو۔ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا اور جب یہ چلا جاتا ہے تو ہاتھ نہیں آتا۔

اور جب یہ چلا جاتا ہے تو ہاتھ نہیں آتا، ہمیں تو قدر نہیں ہے ایک وقت آئے گا لوگ ہمارے قصے بیان کر کے حیران ہوا کریں گے کہ وہ کیسے خوش نصیب لوگ تھے اور ہمیں یہ گپ نہیں ہانک رہا، ہم تا یں ہوں گے لیکن یہ شور ضرور ہو گا کر کوئی تھے، سو اس انمول وقت کے ایک ایک لمحے کو بھی کیوں ضائع کیا جائے چونکہ قرب الہٰی کی منازل کی کوئی انتہا نہیں ہے سب سے اعلیٰ منازل قرب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہیں جب آپکو ہر آن ترقی نصیب ہو رہی ہے تو پھر کون ہے جس نے قرب کی انتہا کو پا لیا ہو جیسے خداوند عالم کی کنہہ کو کوئی نہیں پا سکتا اسی طرح اس کے اوصاف کو بھی نہیں پایا جا سکتا ہے

اے اوّل تو ورائے اوّل
حیراں ز تو انبیاء و رسل

لہٰذا جب ذاتِ باری کی انتہا نہیں ہے تو صفاتِ باری کی بھی انتہا نہیں ہے۔ اگر انسان کو اربوں سال زندگی مل جائے اور وہ ہمہ وقت سیر الی اللہ اور مراقبہ میں مصروف رہے تو سلوک کی انتہا نہیں آتی، عمریں ختم ہو جائیں زمانے تمام ہو جائیں لیکن اس کا انجام نہیں ہے۔

لہٰذا میرے بھائی! اس کے حصول میں ادنیٰ سی کاہلی اور سستی بھی ناقابلِ برداشت ہے انسان کو اپنی بہترین کوشش اس طرف لگا دینا چاہیئے۔

خداوند عالم ہم سبکو توفیق نصیب فرمائے۔

وما توفیقی الا باللہ

⁂

★۔ جہاد۔ اشاعتِ اسلام کے لئے مقرر نہیں ہوا، بلکہ حکومت اسلام قائم کرنے کے لئے مشروع ہوا۔

★۔ اسلام نہ ترک تعلقات کی تعلیم دیتا ہے نہ انہماک فی الدنیا کی اجازت دیتا ہے، بلکہ تعلقات میں اختصار کی تعلیم دیتا ہے۔

★۔ جہاں حق متعین ہو وہاں اہل باطل کو اتفاق پر مجبور کرنا چاہیئے

(ا۔ع۔ت)

اربعین
قسط ۳

حافظ عبدالرزاق ایم اے اسلامیات

احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

۸۔ عن معاویة انه قال خرج رسول الله صلی الله علیه وسلم علی حلقة من اصحابه فقال ما اجلسکم قالوا اجلسنا نذکر الله تعالیٰ ونحمده علی ما هدانا للاسلام ومن به علینا۔ قال آلله ما اجلسکم الا ذالك قالوا الله ما اجلسنا الا ذالك قال اما انی لم استحلفکم تهمة لکم ولکنه اتانی جبریل فاخبرنی ان الله تعالیٰ یباهی بکم الملائکة۔ (مسلم)

"مفہوم! حضرت معاویہ رضؓ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک حلقہ میں بیٹھے ہوئے صحابہ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا تم کاہے کو یہاں بیٹھے ہو عرض کیا ہم اللہ کے ذکر کیلئے اور اس امر کا شکریہ ادا کرنے کے لیئے بیٹھے ہیں کہ اللہ نے ہمیں اسلام اور اپنے ذکر کی ہدایت اور توفیق بخشی ہے۔ فرمایا کیا بخدا تمہارے یہاں بیٹھنے کی غرض یہی ہے۔ عرض کیا بخدا اسی جذبے نے ہمیں یہاں بٹھا رکھا ہے۔ فرمایا میں نے کسی بدگمانی کی وجہ سے تم سے بحلف کہنے کو نہیں کہا بلکہ یہ تو تقریر اور تاکید کیلئے ہے۔ بات یہ ہے کہ جبریل امین میرے پاس آئے اور مجھے خبر دی کہ اللہ تعالےٰ تمہارے اس عمل کی وجہ سے فرشتوں کے سامنے فخر و مباہات کا اظہار فرماتے ہیں"

۱۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام اجتماعی طور پر حلقہ قائم کر کے اللہ کا ذکر کرتے تھے۔

۲۔ ذکر الٰہی کے دوران اللہ تعالےٰ کے احسانات کا استحضار بھی ضروری ہے۔ اور سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے اسلام قبول کرنے اور اپنا ذکر کرنے کی توفیق بخشی ہے۔ (۳) اللہ تعالےٰ ذاکرین کے حلقہ کی طرف اشارہ کر کے فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ دیکھو میرے بندے کس شوق سے ماحول سے کٹ کر میرے ذکر میں مصروف ہیں۔ انہوں نے اپنی خواہشات نفس پر قابو پالیا ہے اور شیطان کو بے بس کر دیا ہے۔ نفس و شیطان کی مخالفت ان کی خصوصیت ہے۔ تمہیں میرا ذکر کرنے میں کوئی مشقت اور مجاہدہ نہیں کرنا پڑتا۔ لہٰذا میرے یہ بندے اس مجاہدہ کی وجہ سے قابل تعریف ہیں اور تم سے سبقت لے گئے ہیں۔

۹۔ عن ابی هریرة رضؓ و ابی سعید رضؓ انهما شهدا علی رسول الله صلی الله علیه وسلم انه قال لا یقعد قوم یذکرون الله الا حفتهم الملائکة

حضرت ابوہریرہ رضؓ اور حضرت ابوسعید رضؓ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو جماعت اللہ کے ذکر کے لیئے بیٹھتی فرشتے انہیں گھیر لیتے ہیں۔ اللہ کی خصوصی رحمت ان پر سایہ کر لیتی ہے۔

وَغشیتھم الرحمۃ ونزلت علیھم السکینۃ وذکرھم اللہ فیمن عندہ۔ (مسلم، احمد، ترمذی، ابن ماجہ)

ان کے دلوں میں سکون و اطمینان نازل ہوتا ہے اور اللہ تعالٰے فرشتوں میں فخر و مباہات سے ان کا تذکرہ فرماتے ہیں۔

ذکر الٰہی کیلئے بیٹھنے سے مراد پوری جمعیت خاطر کے ساتھ ذکر کرنا ہے۔ اس میں ذکر کی مداومت کی طرف بھی اشارہ ہے اس طرح حلقہ ذکر قائم کرنے کے چند فوائد بیان ہوئے ہیں۔

اول: ملائکہ جو اہل ذکر کی تلاش میں پھر رہے ہوتے ہیں وہ حلقہ ذکر کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ ایک تو اجتماعی ذکر کی برکات جمع ہو جاتی ہیں۔ پھر ملائکہ کا ہجوم ان برکات میں مزید اضافہ کر دیتا ہے۔

دوم: اللہ کی رحمت ایک تو عام ہے مگر اس محبوب مشغلہ کی وجہ سے اللہ کی خصوصی رحمت ان پر سایہ کر لیتی ہے۔

سوم: ذاکرین کو سکون دل اور اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب کا اعلان ہو چکا ہے اور یہی وہ دولت ہے جس کے لئے انسانیت ترس گئی ہے۔

چہارم: اللہ تعالےٰ فرشتوں جیسی ہمہ وقت مصروف عبادت مخلوق میں فخر و مباہات سے اس جماعت کا تذکرہ فرماتے ہیں جو اکبر الاعمال میں مصروف ہیں۔

۱۰۔ عن معاذ بن جبل قال ما عمل العبد عملا انجی لہ من عذاب اللہ من ذکر اللہ (مالک والترمذی وابن ماجہ)

حضرت معاذ بن جبل رضی فرماتے ہیں کہ اللہ کا بندہ جو نیک اعمال کرتا ہے ان میں سے اللہ کے عذاب سے سب سے زیادہ نجات دینے والا عمل ذکر الٰہی ہے۔

انسان خطا کا پتلا ہے اور ہر حال میں اللہ کے عذاب سے نجات حاصل کرنے کا محتاج ہے۔ اس غرض سے جو اعمال کئے جاتے ہیں ان کے مختلف درجے ہیں لہٰذا فرمایا کہ نجات کے حصول کا سب سے اونچا عمل اللہ کا ذکر ہے ولذکر اللہ اکبر میں ممکن ہے اسی طرف اشارہ ہو۔

بظاہر یہ حضرت معاذ رضی کا قول نظر آتا ہے۔ مگر شارحین لکھتے ہیں کہ حضرت معاذ نے اپنی رائے سے یہ نہیں فرمایا بلکہ یہ بات مرفوع حدیث کی حیثیت رکھتی ہے۔ احمد، طبرانی اور ابن ابی شیبہ نے ان الفاظ سے مرفوعاً یہ حدیث بیان کی ہے۔ کہ

ما عمل ادمی عملا انجی لہ من عذاب اللہ من ذکر اللہ قالوا ولا الجھاد فی سبیل اللہ قال ولا الجھاد فی سبیل اللہ الا ان یضرب بسیفہ حتی ینقطع قالہ ثلاث مرات۔

(باقی آئندہ)

باتیں ان کی ــــ خوشبو، خوشبو!

ملفوظات حضرت شیخ مکرم مدظلہ العالی

۱۔ فرمایا: حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو خواب میں کئی مرتبہ اللہ تعالےٰ کا دیدار نصیب ہوا ایک مرتبہ انھوں نے عرض کیا کہ کوئی ایسا کلام بتایا جائے کہ میں عذاب قبر سے بچ جاؤں۔ اللہ تعالےٰ کی طرف سے جواب ملا قراۃ القرآن بفہم او غیر فہم (قرآن کریم کی تلاوت، خواہ معانی کو سمجھتا ہو یا نہ سمجھتا ہو)

۲۔ میں اللہ تعالےٰ سے دعا کرتا ہوں کہ زندگی اور موت میں انہی کے ساتھ وابستہ رکھے اور مرنا جینا میرا سواد اعظم کے ساتھ ہو، اتبعوا سواد الاعظم، من شذ، شذ فی النار۔ سوادِ اعظم (بڑی جماعت) کی پیروی کرنا، جو ان سے نکلے گا سیدھا جہنم میں جائے گا۔ اس کے متعلق پوچھا جائے گا کہ اس جماعت سے آپ کا کتنا ربط تھا، سوادِ اعظم سے مراد اہل سنت والجماعت ہیں

۳۔ سلف صالحین پر طعن کرنا گمراہی کا سب سے بڑا سبب ہے۔

۴۔ متکلمین لکھتے ہیں کہ اہل قبلہ کو کافر نہ کہا جائے، لیکن پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اہل قبلہ سے کون لوگ مراد ہیں۔ جو شخص ضروریات دین کا انکار کرے وہ اہل قبلہ میں سے نہیں۔ اور ضروریات دین سے مراد وہ امور ہیں کہ جن سے ایک عام مسلمان خواہ وہ پڑھا لکھا نہ ہو واقف ہو جیسے پانچ نمازیں ماہِ رمضان کے روزے، عذاب قبر، منکر نکیر، کراماً کاتبین وغیرہ وغیرہ۔

۵۔ زمین و آسمان کی روح ذکرِ الٰہی ہے جس وقت اللہ اللہ کرنے والا کوئی نہ رہے گا تو نہ زمین رہے گی نہ آسمان۔

۶۔ ان الملوک اذا دخلوا قریۃً افسدوھا الخ صوفیہ کرام اس آیت کریمہ سے یہ تعبیر بھی لیتے ہیں کہ انسان اپنے بدن اور دل کو ایک ملک یا ایک سلطنت تصور کرے، اس میں حب جاہ، حب مال، حسد تکبر، غرور وغیرہ ہر قسم کی برائیاں موجود ہیں۔ اور یہ سب اپنے اپنے مقام پر خود مختار حاکم یا بادشاہ بنے ہوئے ہیں، لیکن جس وقت رب العالمین کا ذکر اس ملک (یعنی دل) میں داخل ہوتا ہے اور ان پر

حملہ آور ہوتا ہے تو انہیں ذلیل کر کے وہاں سے نکال دیتا ہے، اپنے آپ تو کوئی اپنے ملک، وطن مال و جاہ کو نہیں چھوڑتا، اس کے لیئے جہاد اور مجاہدہ کرنا پڑتا ہے اسی لیئے صوفیہ فرماتے ہیں کہ جب تک لطائف پر پورا مجاہدہ نہ کیا جائے۔ دل سے یہ چیز نہیں نکلتی، صرف نفس کی آمد و رشد سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا۔

— ہمیشہ ترقی اُسی کو دی جاتی ہے جو مجاہدہ زیادہ کرتا ہے اسلسلہ میں اس کے دو رکن ہیں۔
(۱) خلوص دل اور ریاضت مجاہدہ (۲) مکمل اتباع شریعت، کمالات کے دروازے بند ہو چکے ہیں، سوائے اتباع محمدی کے کوئی دروازہ کھلا ہوا نہیں ہے۔ گوہر مراد حضور آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع اور آپ کی جوتیوں کے صدقہ سے ملتا ہے۔

۷۔ سلوک کا پہلا رکن یا سب سے پہلا درجہ اتباع شریعت ہے اگر اس میں خلل آئے تو ایمان میں خلل آئے گا۔ دوسرا رکن اس کا شیخ کے ساتھ قلبی خلوص ہے، اگر اس میں کمی ہوئی تو فیض حاصل نہ کر سکے گا، کیونکہ اس کا تعلق ہی قلب کے ساتھ ہے۔

۸۔ تزکیہ کے حاصل کیئے بغیر، خواہ کتنا ہی بڑا عالم ہو اس کے علم میں پختگی نہیں پیدا ہوتی جب تک وہ اللہ اللہ کرنے والا نہ ہو، حرام حلال کی تمیز نہیں کر سکتا صرف بیان کر سکتا ہے کہ یہ چیز حلال ہے اور یہ حرام — یہ چیز نور نبوت سے اکتساب فیض کرنے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

۹۔ ذکر الٰہی جب پوری طرح قلب میں راسخ ہو جائے تو پھر کسی طرح بھی رذائل اس میں نہیں رہ سکتے مختصراً یوں سمجھیئے کہ دل ایک ہے دوسرا نہیں، رب العالمین کسی غیر کو اس میں دیکھنا پسند نہیں کرتا جیسا کہ بعض بزرگان نے کہا ہے ؎

یک دل داری یک دوست بس است ترا

۱۰۔ شریعت نام ہے کل اور مجموعہ احکام کا، خواہ وہ احکام امور باطنیہ سے تعلق رکھتے ہوں یا اُمور ظاہری کے ساتھ، متقدمین علماء اور صوفیہ تمام اس پر متفق ہیں کہ شریعت لفظ فقہ کے مترادف ہے، شریعت اور فقہ ایک ہی ہے یہ ان کی اصطلاح ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فقہ کی تعریف ہی یہ کی ہے معرفۃ النفس مالہا وما علیہا، یعنی اس کا نفع یا نقصان کس بات میں ہے اس لئے مجموعہ احکام ظاہری اور باطنی سب اس میں آ گئے، متاخرین علماء نے احکام ظاہری پر فقہ کا اطلاق کر دیا اور جو باطن سے تعلق رکھتے ہیں اس پر تصوف کا اطلاق کر دیا وہی شریعت ہے وہی حقیقت ہے شریعت سے ماہر کوئی چیز نہیں۔

۱۱۔ طریقت۔ اُن وسائل ذرائع اور طرق کا نام ہے جن کے ذریعہ سے احکام ظاہری یا احکام باطنی

حاصل کئے جائیں، مثلاً لکھنا پڑھنا، درس تدریس، تصنیف کرنا، تبلیغ کرنا یا کسی سے پوچھ لینا یہ سب شرعی احکام تک پہنچنے کے ذرائع ہیں اور انہیں طریقت سے تعبیر کیا جاتا ہے، طریقت کہتے ہی رستے کو ہیں اور یہ قاعدہ ہے کہ رستے پر طریقت سے تعبیر کیا جاتا ہے، انسان ہمیشہ حصول مقصد کے لیئے ہی حرکت کرتا ہے، مقصد نہ ہو تو حرکت نہیں کرتا، پس حرکت کرنا یا کوئی کام کرنا، رستہ ذرائع یا وسائل اختیار کرنا، یعنی اُمور باطنی اور تصوف کا سیکھنا، لطائف کرنا، مراقبات کرنا وغیرہ یہ سب وسائل ہیں اصل تصوف تو رضائے الٰہی کا حصول ہے اللہ کی رضا حاصل کی جائے، اللہ کی محبت حاصل کی جائے، یہ معلوم ہو کہ اس کی رضا کس میں ہے اور وہ ناراض کس بات میں ہے، یہ دیکھنا کہ اللہ کی محبت اور اللہ کی رضا کس بات میں ہے ـــــ اللہ کی رضا اس کی عبادت اور اتباع محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے کما قال تعالیٰ قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔ اگر آپ اللہ کے محبوب بننا چاہتے ہو اور اللہ کو محبوب بنانا چاہتے ہو تو میری اتباع کرو یہ طریقت ہے۔

۱۲۔ اب ذرا غور کریں کہ حقیقت سے کیا مراد ہے، ایک درجہ تو یہ ہے کہ کسی چیز کی صورت حاصل ہو جائے اور ایک درجہ یہ ہے کہ آدمی پر اس کی حقیقت واضح ہو جائے

مثلاً صوفیہ کرامؒ فرماتے ہیں کہ نماز کی صورت جو ہے وہ تمام مسلمانوں کو حاصل ہے لیکن اس کی حقیقت تک کما حقہ بہت کم لوگ پہنچتے ہیں اسی طرح ایمان کی صورت تو اکثر لوگوں کو حاصل ہے لیکن اس کی حقیقت سے بے خبر ہیں، یعنی جس کے حاصل ہونے کے بعد آدمی سچا مسلمان مومن اور صحیح معنوں میں دیندار بن جاتا ہے۔

ذرا دیکھیں کہ ایمان کی حقیقت اور ایمان کی صورت سے کیا مفہوم ہوتا ہے، علم کی تعریف ہے، حصول صورۃ الشیٔ فی الذہن صورت چیز ذہن میں آجائے یعنی قبول النفس تلک الصورۃ یا نفس اس صورت کو قبول کرلے اس کو علم کہتے ہیں یعنی صورت شئی کا حاصل ہو جاتا، ایمان کی صورت آگئی روزے کی صورت آگئی، کلمے کی صورت آگئی ۔ ۔ ۔ ۔

اب سوال یہ ہے کہ حقیقت سے کیا مراد ہے، مثال کے طور پر کوئی آدمی ہمیں بتاتا ہے کہ ڈی، سی شہر کے فلاں مقام پر آگیا ہے، ہم اس کی بات تسلیم کر لیتے ہیں یہ ایمان تقلیدی ہے، اس کی بات سنی قبول کرلی۔ عوام کا ایمان جو ہے تقلیدی ہے تقلیدی ایمان تشکیک مشکک سے زائل ہو جاتا ہے، کسی نے شک میں ڈالا تو وہ اس

چیز کو چھوڑ بیٹھا۔ گمراہی کا اصل سبب عام طور پر یہی ہے، یعنی جیسی صحبت ملی اس کے رنگ میں ڈھل گئے۔ ان کو ایمان کی حقیقت تک رسائی نہیں ہوئی اس لیے گمراہ ہو جاتے ہیں۔

دوسرا۔ استدلالی ایمان ہے یعنی جو دلائل سے ثابت ہو، مثلاً ایک آدمی اڈے پر گیا دیکھتا ہے کاریں کھڑی ہیں موٹریں موجود ہیں، پولیس اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہے، آدمی کھڑے ہیں، دلائل موجود ہیں قرائن سے پتہ لگتا ہے کہ کوئی بڑا آدمی آیا ہے یہ ہے ایمان استدلالی۔

کشفی ایمان یہ ہے کہ آدمی اندر چلا جائے اور خود مشاہدہ کر لے، اندر جا کر دیکھ آئے یہ حقیقت ہے اب اگر ہزارہا آدمی بھی کہیں کہ ڈی سی نہیں آیا تو یہ کہے گا کہ تم جھوٹ بولتے ہو میں خود دیکھ کر آیا ہوں۔ اب دنیا کی کوئی طاقت اسے گمراہ نہیں کر سکتی، اس کو حقیقت کہتے ہیں یعنی انتہا تک پہنچنا۔

۱۲۔ معرفت کا مطلب ہے پہچان لینا، بعض اس سے یہ مراد لیتے ہیں کہ رستے میں جو کچھ اس کے اسباب و ذرائع پہچانے گئے ہیں، یہ معرفت ہے، مگر میری تحقیق یہ ہے کہ جس کو جس وقت یہ چیز پوری حاصل ہو جائے معرفت حاصل ہو گئی، شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت یعنی انتہا تک پہنچنا یہی تصوف و سلوک کا مقصود ہے، جسے یقین کامل اور اطمینان ہوتا ہے، یہی اس تک پہنچتا ہے۔

مجلس ذکر ملتان کے پروگرام

ہفتہ وار:۔ ہر جمعرات بعد نماز مغرب قلعہ کہنہ مسجد
۲۔ بروز ہفتہ بعد نماز عشا جنرل حمزہ مسجد

ماہانہ:۔ ہر شمسی ماہ کا پہلا جمعۃ المبارک
بوقت دس بجے صبح
جنرل حمزہ مسجد صدر چھاؤنی
ملتان

اصلاح نفس

تقریر: حضرت مولانا عبدالغفور عباسی مدنیؒ

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الایمان بضعٌ وسبعون شعبۃ افضلھا قول لا الٰہ الا اللہ وادناھا اماطۃ الاذیٰ عن الطریق۔

جس طرح حدیث کا ظاہر ہوتا ہے اسی طرح حدیث کا باطن بھی ہے جیسے اس حدیث کی تشریح حافظ شیرازی نے اس شعر میں کی ہے

بردار خار و سنگ ز راہ ایں
یعنی وجود خود ہمہ بردار از میاں

یعنی ہمارا وجود خود شریعت کی راہ کے لیئے مانع ہے، اس کو جب تک اللہ کی رضا میں فنا نہیں کریں گے کچھ حاصل نہیں ہوگا جب تک نفس میں خودی موجود ہے کبھی قرب حاصل نہیں ہوگا، اس لیئے نفس کی اصلاح ضروری ہے اور یہی حصول الی اللہ کے راستہ میں پتھر اور کانٹا ہے، اس لیئے ہمارے حضرات فرماتے ہیں:

"پستی ما باعث ہستی ما
پستی ما باعث سربلندی ما"

جیسا کہ زمیندار لوگ زمین میں دانے ڈالتے ہیں جو دانہ اپنی ہستی مٹا کر گل ہو جاتا ہے اس سے ہزارہا دانے پیدا ہوتے ہیں اور جو باقی رہ جاتا ہے وہ پرندوں کا چارہ بن جاتا ہے، شریعت کا اور قرب حق کا معنوی راستہ ہے، اس میں ہمارا وجود کانٹا ہے اس میں شک نہیں کہ زندگی کا مقصد ذکر حق ہے اور قلب کی بیماریاں رکاوٹ ہوتی ہیں اس لیئے شیخ کامل کی ضرورت ہے جس درجے کی عبادت ہوگی اسی طریقہ کا درجہ ہوگا شریعت مقدسہ پر چلنا ضروری ہے تاکہ شریعت مقتضائے طبیعت ہو جائے، نہ اڑانا ہے نہ اڑانا ہے نہ کشونات حاصل کرنا ہے مقصد رضائے حق ہے اور یہ شریعت مقدسہ پر چلنے سے ہوگا جس طرح ہر چیز کے لیئے رکن ہوتے ہیں اس کے لیئے موانع بھی ہوتے ہیں جیسے نماز کے لیئے طہارت وغیرہ سب شرائط موجود ہوں۔ لیکن طلوع آفتاب کا وقت ہے یہ مانع ہے۔

اس وجہ سے نماز ناجائز ہے کیونکہ مانع موجود ہے، مالدار آدمی ہے، زکوٰۃ فرض ہے لیکن بخل ہے تو مانع ہے اس وجہ سے وہ زکوٰۃ دینے سے رک جاتا ہے بخل جائے اور سخاوت پیدا ہو اور حب جاہ و مال نکل جائے تب زکوٰۃ جائز ہے جیسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ادبنی اللہ فاحسن تادیبی وہ آداب حضور پرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کو سکھائے، صحابہؓ کے ذریعہ سے مشائخ نے ہمیں آداب سکھائے والدین کے آداب مرشد کے آداب نہ ہونے کی وجہ سے گرتے جاتے ہیں حضرت خواجہ معصوم فرزند مجدد صاحبؒ سے پوچھا گیا فنا و بقا کیا ہے فرمایا فنا افعال و صفات رزیلہ گم ہو جائیں اور بقا صفات حمیدہ باقی رہ جائیں بخل جائے اور سخاوت آئے یہ بقا ہے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الشریعۃ اقوالی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وافعالہٗ واحوالہٗ وطریقۃ

حقیقت ان اعمال میں اخلاص کا پیدا ہونا ہے اور معرفت ان سب کا ثمرہ ہے، جس کے بارہ میں حدیث میں آیا ہے اُعبد اللہ کانک تراہ الخ یعنی ایسی کیفیت حاصل ہو کہ رب تعالےٰ کو دیکھ رہا ہے فان لم تکن تراہ فانہ یراک، مراقبہ کا مقام بھی ایسا ہے جیسے کہ مرشد یا استاد موجود ہو تو اس کے سامنے کوئی بدفعلی نہیں کرے گا خالق حقیقی ہر وقت دیکھ رہا ہے یا ایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ کونوا مع الصادقین۔ سچے اپنے اقوال میں اہل اللہ ہیں لیکن اپنے آپ کو سب سے نیچے سمجھتے ہیں حضرت علی رامیتیؒ سے کسی نے پوچھا، آدمی بالغ کب ہوتا ہے فرمایا شریعت میں جب منی نکلے طریقت میں جب "منی" یعنی خودی سے نکل جاوے خودی اور خود بینی سے بھی نکل جائے، پہلے امراء علماء کی مالی خدمت کرتے تھے اور علماء ان کو شریعت و سنت سکھاتے تھے حضرت ابو درداءؓ اور حضرت سلمان فارسیؓ کا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مواخاۃ کرایا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابو درداءؓ بیت المقدس چلے گئے اور سلمان فارسیؓ عراق کے علاقہ میں منتقل ہو گئے حضرت ابو درداءؓ نے خط لکھا کہ الحمد للہ الذی انزلنی فی الارض المقدسۃ واعطانی مالاً و اولاداً یعنی اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے مدینہ طیبہ سے نکالا پھر مجھے بیت المقدس میں رکھا، اور مجھے مال اور اولاد عطا فرمائی اور تو عراق میں ہے حضرت سلمان فارسیؓ نے جواب لکھا فاعلم یا ابا درداء ان الارض المقدسۃ لا تقدس الا انسان ولکن تقدس الانسان بالاعمال الصالحۃ والاخلاق الفاضلۃ فیالیت اعطاک اللہ بدل المال علماً نافعاً وبدل اولاد عملاً صالحاً۔

"یعنی اے ابو درداء ارض مقدس انسان کو مقدس نہیں بناتی بلکہ انسان اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ سے مقدس ہوتا ہے اور تو نے لکھا ہے کہ اللہ نے مجھے مال

اور اولاد عطا فرمائی - افسوس کہ تجھے مال
کے بدلہ میں علم نافع دیتا اور اولاد کے
بدلہ میں عمل صالح عطا فرماتا، تو انسان
کے لئے اصل چیز یہی دو چیزیں ہیں
اعمالِ صالحہ اور اخلاقِ فاضلہ"

حضرت فضیل علی قریشیؒ نے فرمایا مجھے تین گروہ سے محبت ہے علماء، اہل بیت اور حفاظ اور یہ کمال ایمان ہے کہ یہی بنیاد دین ہے فرمایا جس عالم سے ملو اپنے کو طالب علم سمجھو اور جس پیر سے ملو اپنے کو مرید سمجھو الحمدللہ یہ چیز فقیر کو حاصل ہے یہ شیخ کی برکت ہے ہر مسلمان کو اپنے سے اوپر سمجھتا ہوں، المومن مرآۃ المومن، مومن عیب بتادے گا لیکن اس کی تحقیر نہ کرے گا خطاب خاص سے معیوب نہ کرے گا پہلے زمانے میں یہ طریقہ تھا کسی شخص نے کوئی مسئلہ پوچھا وہ فرماتے کہ تیرے محلہ میں بڑا عالم ہے اس سے پوچھیں، خدا کے بندے وہ بڑا عالم ہے آپ نے بے ادبی کی کوئی اور بزرگ بتا دیتے فرمایا میں بھی طالب علم ہوں راستے پر چل رہا ہوں اللہ تعالے پہنچادیگا ہارون الرشید نے علماء و صلحا کو بلایا، علماء کو دعوت کھلائی اور پوچھا کہ تم میں کون بڑا عالم ہے ہر کسی نے اپنی تعریف کی کسی عالم نے کہا میں فقہ کا عالم ہوں کسی نے کہا میں حدیث کا عالم ہوں - اور فقراء سے پوچھا کہ تم میں کون زیادہ صالح ہے پہلے نے کہا میرے پیچھے والا اسی طرح آخر والے سے دریافت کیا تو اس نے کہا کہ جو ہم سے آگے ہے وہ بڑا فقیر اور صالح ہے ہارون نے سمجھ لیا کہ فقراء اپنے آپ کو سب سے ادنیٰ سمجھتے ہیں۔

فرمایا کہ پندرہ آنے رابطہ شیخ ہے اور ایک آنہ ذکر وغیرہ ہے افضل الاعمال ادخال السرور فی قلب المومن یعنی کسی مومن کو تیری وجہ سے کوئی تکلیف نہ پہنچے ۔

مباش درپئے آزار ہرچہ خواہی کن
کہ در طریقت ما غیر ازیں گناہے نیست

ہمارے حضرات فرماتے ہیں کہ واردات اور فیوضات ربانی مثل پانی کے ہیں جو نیچی جگہ ہوتی ہیں وہیں پانی جمع ہوتا ہے دو حوض متساوین میں سے کبھی ایک کا پانی دوسرے میں نہیں جاتا، ہر کجا پستی است آب آنجا رود اسی واسطے اللہ تعالے نے فرمایا ہے لقد نصرکم اللہ ببدر وانتم اذلۃ

" یعنی اللہ تعالے کی مدد اس وقت آئی
جبکہ صحابہ نے اپنے آپ کو کچھ نہ سمجھا
ذلت کے بعد نصرت آئی ہے"

ہم خودی کے دعوے مارتے ہیں،
شرک الاغراض میں ہر شخص پکڑا ہوا ہے
اللہ تعالے ہم سب کو بچائے۔

المرشد کا سالانہ
چندہ
۵/۰ روپے ہے اور
فی پرچہ ۳ روپے

پروفیسر محمد غلام محلہ سعید خیل
مکی مروت بنوں

حسین و سادہ و رنگین ہے داستانِ حرم

مرد ہو یا عورت، چھوٹا ہو یا بڑا بوڑھا ہو یا جوان عالم ہو یا جاہل متقی و پرہیزگار رند مشرب غرضیکہ امت مسلمہ کے ہر فرد کے دل میں حرم پاک کے ساتھ وابستگی اور محبت ودیعت کی گئی ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ حرم پاک کے معمار نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ اے اللہ لوگوں کے دلوں کو ان کی جانب مائل کر اور کیوں نہ ہو جبکہ اس کی پوری داستان ہی محبوب حقیقی کے ساتھ عشق و محبت خلوص و وفاداری اور اتقیاد و فرمانبرداری کی حسین داستان ہے محبوب حقیقی کو اپنے عشاق کی یہ ادائیں یہ شوریدہ سری اور انقیاد و امتثال کا یہ جذبہ اتنا پسند آیا کہ ان کی پوری داستان کو زندہ و تابندہ رکھا۔

آیئے آج ہم بھی اس حسین و سادہ و رنگین داستان کا مختصر مطالعہ کر لیں ہمارے جد امجد حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے خلیل اللہ کے لقب سے نوازا تو فرشتوں نے عرض کی کہ اے رب جلیل خلیل تو اس دوست کو کہتے ہیں جو رضائے دوست کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو حرم پاک کے معمار حضرت ابراہیم خلیل کی پوری زندگی فرشتوں کے اسی سوال کا عملی جواب ہے انہوں نے اور ان کی آل و اولاد نے عملاً یہ ثابت کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کے سچے عاشق وہ کام کر گزرتے ہیں جو عقلاً محال ہوں ان کے دلوں میں عشق و محبت کے وہ طوفان اُمڈ آتے ہیں کہ عقل کے تنکے ان میں بہہ جاتے ہیں ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اللہ تعالیٰ کا یہ خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے محبوب کے حکم سے اپنی پیاری بیوی ہاجرہ اور چہیتے شیر خوار بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ساتھ لے کر حیرون سے روانہ ہوئے مکہ معظمہ پہنچکر مقام زمزم میں قیام فرمایا اس وقت یہ پورا علاقہ بالکل غیر آباد لق و دق صحرا تھا، سبزہ کا کہیں نام نہ تھا کوسوں پانی کا کوئی نشان نہ تھا اسی چٹیل میدان میں اللہ تعالیٰ کے اس عاشق صادق نے اپنے محبوب کے حکم سے پیاری بیوی اور معصوم بچے کو تھوڑے سے پانی اور کھجور کے ساتھ چھوڑ کر الوداع کہی اور انھیں اللہ کے حوالے کر دیا حضرت ہاجرہ کو معلوم ہوا کہ خلیل ہمیں اس بے آب و گیاہ میدان میں چھوڑ کر جا رہے ہیں تو وہ گھبرا کر ان کے پیچھے دوڑیں اور بآواز بلند کہا مَنْ اَمَرَکَ اَنْ تَتْرُکَنَا بِاَرْضٍ لَیْسَ فِیْھَا زَرْعٌ وَّ لَا مَاءٌ؟ یعنی اے میرے سرتاج تم کو یہ حکم

کس نے دیا ہے کہ ہم کو بے آب وگیاہ میدان میں چھوڑے جا رہے ہو،

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا کہ اَمَرَنِیْ رَبِّیْ میرے پروردگار کا حکم ہے۔ یہ جواب سنکر حضرت ہاجرہؓ مطمئن ہوئیں اور یقین کے ساتھ کہا فَاِذَنْ لَنْ یُّضَیِّعَنَا تب وہ ہمیں ہرگز ضائع نہیں ہونے دے گا۔

پانی اور کھجوروں کا وہ تھوڑا سا ذخیرہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے پاس چھوڑ کر گئے تھے چند ہی دنوں میں ختم ہوا تو بی بی ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام دونوں مارے پیاس کے تڑپنے لگے بی بی ہاجرہ پانی کی تلاش میں صفا کی پہاڑی پر چڑھ گئیں تاکہ دیکھیں اگر کوئی قافلہ آ رہا ہو تو اس سے پانی مانگ لیں، یہاں سے اتر کر مروہ کی طرف روانہ ہوئیں ماں کی ممتا اپنے بچے سے بھی نگاہ ہٹانے کی اجازت نہیں دیتی تھی چنانچہ صفا سے مروہ جاتی ہوئی رستے میں کچھ نشیبی علاقہ تھا، بچہ نظروں سے اوجھل ہوا تو دوڑ کر مروہ کی طرف بڑھنے لگیں اور مروہ پہاڑی پر چڑھ گئیں پانی کی تلاش میں انھوں نے صفا اور مروہ پہاڑیوں کے درمیان سات چکر لگائے، اب کے ان کے کان میں بچے کے رونے کی آواز آئی دیکھا تو حضرت اسماعیل علیہ السلام کے پاس ایک شخص کو کھڑا پایا گھبرا کر ان کی طرف آئیں، حضرت اسماعیل علیہ السلام زمین پر پاؤں مار رہے تھے اللہ تعالیٰ کو اس معصوم بچے کا بے بسی سے پاؤں مارنا اور رونا اتنا پیارا لگا کہ وہاں زمزم کا چشمہ پیدا کیا جس سے اب تک اربوں لوگ محبت کی پیاس بجھانے کے لئے پانی پی چکے ہوں گے اور پیتے رہیں گے۔

بی بی ہاجرہ کی قربانی اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی معصوم اداؤں کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے آبِ زمزم کو شرف بخشا کہ دو دفعہ فخرِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک کو شقِ صدر کے موقعہ پر آبِ کوثر کی بجائے اسی پانی سے دھویا گیا۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ اپنے شیدائیوں کو محبوب حقیقی نے کیسی کیسی آزمائشوں میں ڈالا اور پھر خود انھیں ان آزمائشوں میں کامیابی عطا فرما کر ان کی یادگاروں کو بقا بخشی بی بی ہاجرہ کو پانی کی تلاش میں خود ہی صفا اور مروہ کے درمیان دوڑایا پھر خود ہی پانی کا چشمہ ظہور فرما کر قیامت تک سعی کے نام سے یادگار رہنا دیا اور چشمہ زمزم کو وہ شرف بخشا جو آبِ کوثر کو بھی نصیب نہیں ہے

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گذر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

بی بی ہاجرہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی پندرہ سال تک تربیت کر کے اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئیں اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اس دنیا میں ثابت قدمی کا پہاڑ بنا کر چھوڑا۔

بی بی ہاجرہ کی وفات کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے مکہ معظمہ جا کر اپنے گھر کی تعمیر کا حکم دیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام مکہ تشریف لائے اور بچھڑے ہوئے چہیتے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے مل کر خانۂ خدا کی تعمیر شروع کی حضرت ابراہیم نے معمار اور حضرت اسماعیل نے مزدور بن کر خانہ کعبہ کی دیواریں اٹھانا شروع کیں یہ بھی ایک

عجیب و دلکش سماں تھا، معمار بھی پیغمبر اور مزدور بھی پیغمبر، اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ سعی اتنی پسند آئی کہ قرآن پاک میں اس کا ذکر بطور یادگار کے فرمایا ارشاد ہے وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ یعنی وہ منظر (بوجہ دلکشی اور امتثال حکم محبوب کے قابل یاد ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل نے خانہ کعبہ کی دیواریں اُٹھا رہے تھے، جس خلوص اور عاجزی سے انہوں نے تعمیر شروع کی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بنائے ہوئے گھر کو اپنا گھر کہہ کر پکارا اور تاقیامت مرجع خلائق بنایا سچ ہے کہ خلوص کا درخت ضرور پھلتا پھولتا ہے چاہے دیر سے کیوں نہ ہو۔

خانہ کعبہ کی دیواریں جب قد آدم سے اونچی ہوئیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو زینے کی ضرورت پیش آئی اللہ تعالیٰ کو اپنے پیاروں کا امتحان لینا مقصود تھا انہیں تکلیف میں ڈالنا نہ تھا چنانچہ جبل ابوقبیس کے ایک پتھر کو حکم دیا گیا کہ میرے خلیل کی تعمیر کعبہ میں مدد کرنا، پتھر میں لچک پیدا ہوئی، ضرورت کے مطابق وہ پتھر کبھی بلند ہو جاتا اور کبھی سکڑ کر پست ہو جاتا وہ پتھر جس سے خانہ کعبہ کی تعمیر میں مدد لی گئی قابل احترام بنا دیا گیا اللہ تعالیٰ نے اُسے خانہ کعبہ کے طواف کرنے والوں کے لئے جائے نماز بنا دیا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِیْمَ مُصَلًّی یعنی مقام ابراہیم کے پاس (نفل) نماز پڑھ لیا کرو۔

کیا شانِ کریمی ہے اس ذات کریم کی کہ خود آزمائش میں ڈالا خود ہی آزمائش میں پورا اترنے کے لئے ذرائع و اسباب مہیا فرمائے اور کامیابی کی بشارت کے بعد ان کی کوشش کو تاقیامت زندہ و تابندہ رکھا۔

بات یہاں آکر ختم نہیں ہوئی بلکہ اللہ تعالیٰ کے ان شیدائیوں نے رضائے محبوب کی خاطر قربانی کا ایک اور معیار قائم کرنا تھا چنانچہ تعمیر بیت اللہ کے بعد حضرت ابراہیم کو ایک اور کٹھن امتحان کا سامنا ہوا انہیں حکم دیا گیا کہ اپنے بیٹے اسماعیل کو میری رضا کی خاطر اپنے ہاتھوں قربان کرنا ہوگا، اللہ تعالیٰ کے اس سچے خلیل نے فوراً تعمیل حکم کی تیاری شروع کی رسی کلہاڑا اور چھرا لے کر حضرت اسمٰعیل کی معیت میں جنگل کی طرف روانہ ہوئے راستے میں انسان کے ازلی دشمن شیطان مردود نے باپ اور بیٹے دونوں کو امتثال حکم سے روکنے کی پوری کوشش کی، انسانی شکل میں ظاہر ہو کر بظاہر ہمدردانہ لہجہ میں انہیں طرح طرح کے چکمے دیئے لیکن بتوفیق الٰہی یہاں بھی وہ دونوں استقامت کے پہاڑ بنکر کامیابی سے ہمکنار ہوئے اور شیطان کو مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا۔

اس مردود کو دھتکارنے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مناسب سمجھا کہ اپنے خواب کو اپنے بیٹے پر عیاں کر دیں (یاد رکھیئے کہ پیغمبروں کے خواب بھی وحی کا درجہ رکھتے ہیں) چنانچہ قرآن پاک میں باپ بیٹے کی اس گفتگو کا نہایت دلکش انداز میں ذکر کیا گیا ہے فرمایا یٰبُنَیَّ اِنِّیْ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی یعنی اے میرے پیارے بیٹے میں خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہیں ذبح کر رہا ہوں۔ تابع فرمان بیٹے نے فرمانبرداری کا ثبوت دیتے ہوئے عاجزانہ انداز میں عرض کیا۔ یٰۤاَبَتِ افْعَلْ

يَا اَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي اِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصَّابِرِيْنَ

اے ابا جان جو کچھ آپ کو حکم دیا گیا اسے کر گزریئے انشاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے

اس کے بعد جو دلدوز نظارہ پیش آیا وہ انسانی بیان سے باہر ہے، خود قرآن پاک ان کی تعریف اس طرح مدح سرا ہے فَلَمَّا اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ یعنی جب اللہ تعالےٰ کے حکم کی تعمیل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو زمین پر پیشانی کے بل لٹا کر اُن کے گلے پر چھری چلانے لگے تو آسمان کے فرشتوں سے یہ نظارہ نہ دیکھا جا سکا وہ بے ساختہ چلانے لگے کہ اللہ واقعی ابراہیم تیرا خلیل ہے اللہ تعالےٰ نے چھری کو حکم دیا خبردار میرے عاشق صادق کے بیٹے اور میرے شیدائی کے بال کو بھی بیکا نہ کرنا۔ اللہ تعالےٰ کی جانب سے ارشاد ہوتا ہے وَنَادَيْنَاهُ اَنْ يَّا اِبْرَاهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۔ اے ابراہیم تو نے اپنے خواب کو سچا کر دکھایا یہ ہماری جانب سے ایک بہت ہی بڑا امتحان تھا اس امتحان میں تم کامیاب قرار دیئے گئے اس کامیابی کی یادگار ہیں آج بھی امت مسلمہ دسویں ذی الحجہ کو جانور ذبح کر کے عید مناتے ہیں۔ درحقیقت یہ اُن کے عرق انفعال کے موتی ہیں جو شانِ کریمی نے چن لئے ہیں ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیئے
قطرے جو تھے میرے عرقِ انفعال کے

ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں

بقیہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی میراث

ظاہری اور روحانی دونوں پہلوں کے وارث ہیں۔ اور یہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقیقی میراث ہے۔

الحمد للہ آج اس گئے گزرے دور میں سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کے پیشوا حضرت العلام مولانا اللہ یار خان کی شخصیت ظاہری طور پر بحر العلوم اور روحانی طور پر قلزم فیوض کا درجہ رکھتی ہے آپ کی روحانی تعلیم و تربیت کا خلاصہ ہے کہ مریدین کو روحانی طور پر دربار نبوی میں پہنچانے اور اعلیٰ منازل سلوک کی طرف گرم پرواز کراتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے حلقہ ذکر میں آنے والوں کی سالوں میں نہیں دنوں میں کایا پلٹ جاتی ہے۔ وہ شریعت پر کماحقہٗ عمل پیرا ہو کر جادۂ طریقت پر گامزن ہو جاتے ہیں اور این سعادت بزور بازو نیست

★

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی میراث

پروفیسر باغ حسین کمال

ہستیِ باری تعالیٰ ایک مخفی خزانہ تھا۔ اس نے چاہا کہ پہچانا جائے۔ اس ارادے کی تکمیل میں کائنات وجود پذیر ہوئی اور ناپیدا کنار و لا انتہا کائنات کے ایک حقیر ذرۂ زمین کو گوناگوں مخلوقات سے آباد اور حضرت انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ دے کر ان سب کو اس کی خدمت کے لئے زیرِ نگیں کر دیا گیا اور غایت تخلیق انسانی محض عبادت الٰہی قرار دی گئی۔ اور طریقہ عبادت سکھانے اور ضابطہ حیات پر چلانے کے لئے ہر دور میں انبیائے کرام کو مبعوث کیا جاتا رہا۔ ان انبیائے کرام میں چند کو اولوالعزم پیغمبر کے منصب سے نوازا اور ہمارے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سب کا پیشوا بنایا گیا۔ گویا تاجدار رُسل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجود مسعود خلاصۂ کائنات ٹھہرایا گیا۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے

"درحقیقت ہیں اللہ نے مسلمانوں پر بڑا احسان کیا ہے جب کہ انہی میں ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا اور انھیں پاک صاف کرتا اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے"

گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی تربیت کے لئے دو انداز اختیار فرمائے، ایک علمی یا ذہنی اور دوسرا روحانی اور قلبی پہلے طریقے سے آپؐ نے قرآنِ حکیم کی آیات و احکام اور دیگر اصولِ حیات و حکمت سکھائے اور دوسرے طریقہ سے اپنی نگاہ کیمیا اثر کے فیض سے ایمان لانے والوں کے شیشہ ہائے قلوب سے قبل از اسلام گناہوں اور غیر اللہ کی محبت کی تمام تر کثافت اور زنگ آثار کر اللہ کریم کے لیے شدید محبت کا رنگ رچا کر فرمایا۔

پہلا طریقہ زبان و بیان سے متعلق ہے۔ اور دوسرا طریقہ الفاظ و تلقین کی بجائے القائی اور انعکاسی اثرات کا حامل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جونہی جو شخص ایمان لانے کی غرض سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا، اس کے قلب پر ایک نگاہِ معجز اثر پڑی اور وہ صحابیت کے عظیم ترین منصب سے سرفراز اور نفس کی تمام تر آلائشوں اور وساوسِ شیطانی سے پاک صاف ہو گیا۔ اسی روحانی تربیت کا یہ اعجاز تھا کہ صحبتِ رسالت میں پہنچتے ہی توان پڑھ، اُجڈ وحشی اور اکھڑ ہوتے ہیں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب کو ایک ہی درس دے رہے ہیں۔ مگر جب مجلس برخاست ہوتی ہے تو ہر کوئی اپنی اپنی استعداد کے مطابق عالم، فقیہ، مفسر، مصنف، حاکم، سپہ

اور جبریل بن کر ایمان و یقین کی قوتِ لازوال سے مالا مال ہو کر باہر نکلتا ہے ؎

جس طرف ان کے اشارے ہو گئے
جتنے ذرّے تھے ستارے ہو گئے

ذرا چشمِ تصور وا کیجئے۔ کیا یہ تاریخ عالم کا محیر العقول واقعہ نہیں کہ ایک صحابیؓ کو اسلام لانے کے دوسرے دن اسلامی لشکر کا سپہ سالار اور دوسرے کو قیصر روم کے دربار میں سفیر بنا کر بھیج دیا جاتا ہے مگر اس شک کا شائبہ تک نہیں کہ کہیں یہ دشمن سے ساز باز کر کے تحریک اسلامی کو گزند پہنچانے کا باعث نہ بن جائیں۔ اک نگاہِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فنونِ حرب اور آداب سفارت سے مکمل طور پر بہرہ ور فرما کر قوتِ ایمانی کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔

روحانی تربیت کا یہی وہ نسخہ کیمیا ہے جو رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے واسطے سے سینہ بسینہ امتِ مسلمہ میں جاری رہ کر تاقیامت ظلمت گزیں قلوب کو نور نور کرتا رہے گا۔ دین متین کا یہی وہ روحانی رُخ ہے جو علماءِ ظاہر کے ہاں قطعاً مفقود رہا ہے۔ یہاں تک کہ امام غزالیؒ، امام رازیؒ۔ اور مولانا رومیؒ جیسے یکتائے روزگار علماء و فضلاء اپنے تمام تر ظاہری کمالاتِ علمی کے باوصف روحانی کسبِ فیوض کے لئے درِ درویشاں خدامت حضرت شیخ ابو علی فارمدیؒ۔ حضرت نجم الکبریٰؒ اور حضرتِ شمس تبریزیؒ کے حضور زانوئے ادب تہہ کرنے پر مجبور ہوتے۔ اس لئے کہ یہ وہ دولت غیر مشتبہ ہے جو کتابوں کے سفینوں کی بجائے مردانِ کامل کے سینوں کے گنجینوں میں محفوظ ہوتی ہے۔ اور اسے الفاظ و عبارت کی بجائے عمل انعکاس و القاء سے سینۂ شیخ سے اخذ کیا جاتا ہے اور اسی روحانی توجہ کے زیر اثر روحِ سالک ان وراء الوراء روحانی منازل کی طرف گرم پرواز اور عرش پیما ہوتی ہے۔ جہاں ستارے گردِ راہ کی صورت کہیں دور پیچھے رہ جاتے ہیں ـــ یہی وہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی روحانی میراث ہے۔ جو ہر دور میں اولیائے کرام کو ودیعت رہی اور تا قیامت حاصل رہے گی۔ انہی اولیائے کرام میں سے بعض کو خصوصی روحانی مناصب سے نوازا جاتا ہے۔ انہی حضرات کے دم قدم اور ذکر الٰہی کے کی ظاہری روحانی برکات سے رحمت باری تعالیٰ اہل عالم کے شاملِ حال ہوتی ہے

ان مناصب کی تفصیل حسبِ ذیل ہے

صدیق
قطبِ وحدت
فرد
قیوم
غوث
قطب الاقطاب

- قطبِ ابدال — ابدال
- قطبِ مدار — اوتاد
- قطبِ شریعت — نجباء و نقباء، اخیار، ابرار

صدیق، قطبِ وحدت۔ فرد اور قیوم کے چار

مناصب صحابۂ کرام اور خیر القرون کے دور سے مختص
تھے مگر غوث اور اس کے نیچے کے مناصب ہر زمانہ میں
موجود ہوتے ہیں - یوں سمجھئے کہ غوث تمام دنیا کی
روحانی حکومت کا صدر ہوتا ہے - اور چاروں اقطاب
اس کے وزراء کا درجہ رکھتے ہیں - ان میں قطب الاقطاب
بطور سیکرٹری فرائض انجام دیتا ہے - قطب مدار کو
اللہ تعالیٰ نے بقائے عالم کا سبب بنایا ہے - اس کے وجود
کی برکت سے بقاء سے متعلق امور میں وصولِ فیض کا ذریعہ
ہے - اس لئے پیدائش، رزق، مصائب، صحت و آرام
کے حاصل ہونے کا تعلق قطبِ ابدال کے فیض سے مخصوص
ہے - اور ایمان، ہدایت، نیک کاموں اور توبہ وغیرہ
کی توفیق قطبِ ارشاد کے فیض کا نتیجہ ہے -

تقریباً چالیس ابدال قطب ابدال کے نائب،
چار اوتاد، قطبِ مدار کے نائب اور متعدد نجباء، نقباء،
اخیار، ابرار، قطبِ شریعت کے نائب ہوتے ہیں

روحانی تعلیم تربیت کا دائرہ عمل قلبِ انسانی
سے شروع ہوتا ہے - چنانچہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ
وسلم کا ارشادِ گرامی ہے

"انسان کے جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے
وہ اگر ٹھیک ہو جائے تو سارا جسم درست ہو جاتا ہے
اور اگر خراب ہو جائے تو سارا جسم فاسد ہو جاتا ہے -
سنو وہ دل ہے"

گناہوں سے قلبِ انسانی سقیم ہو جاتا ہے اور
قلبِ سقیم کو قلبِ سلیم میں بدلنے کے لیے نسخہ
شفا بزبانِ ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صرف
اور صرف ذکرِ الٰہی ہے - چنانچہ ارشاد ہے -

"ہر چیز کی صیقل ہوتی ہے اور دل کی صیقل
اللہ کا ذکر ہے"

ذکرِ الٰہی کے باب میں ارشادِ خداوندی ہے ؛ -

۱- "صبح و شام اپنے ربّ کے نام کا ذکر کرو"

۲- "اور جب نماز پڑھ چکو تو اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹے اللہ کا
ذکر کرو"

۳- "اے ایمان والو! اللہ کا ذکر بہت کثرت سے کرو
خصوصاً صبح و شام اس کی تسبیح کیا کرو"

۴- "اور اپنے رب کا ذکر عاجزی اور خوف سے دل
میں اور دھیمی آواز سے (ہمیشہ) صبح و شام کیا کرو
اور غافلین میں سے نہ ہو" -

گویا غایتِ عبادت یہ ہے کہ انسان کا دل کسی لمحے
بھی اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہ ہونے پائے اور اس
یادِ الٰہی کو ہمیشہ دائمی طور پر دل میں جاگزین کرنے کے لئے
ہی صوفیائے کرام قلب اور سینے میں چند دوسرے مقامات
(جنہیں تصوف کی اصطلاح میں لطائف سے تعبیر کیا جاتا ہے)
پر تصور جما کر اسمِ ذاتِ الٰہی (اللہ) کی ضربات و اشغال
اختیار کرتے اور سالکین کے قلوب اور متذکرہ مقامات پر
اپنی روحانی توجہ القاء کرتے ہیں - اس باطنی توجہ کی تائید
اس حدیثِ پاک سے ہوتی ہے

"پھر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابو محذورہ رض
کے ماتھے پر ہاتھ رکھا پھر ہاتھ کو اس کے چہرے پر سے
گئے پھر سینے پر - پھر آپ کا ہاتھ اس کی ناف تک پہنچا پھر
آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا دی کہ اللہ برکت دے"

حیاتِ انسانی جسم و روح کے اتصال سے عبارت ہے۔ جس طرح ظاہری جسم کے چہرے کے حصے ہیں۔ اللہ کریم نے مختلف حواس کے لئے اعضاء کان، آنکھ، ناک اور زبان بنائے ہیں۔ اور سارے جسم میں قوتِ لامسہ رکھی ہے اسی طرح روح کے حواس (لطائف) قلب، روح سرّی، خفی اور اخفاء ہیں جن کا محل سینے میں مختلف مقامات ہیں۔ یوں سمجھو۔ لیجئے کہ ہمارے سینے میں پانچ شیشے ہیں جو ہمارے گناہوں کے نتیجہ میں زنگ آلود ہو جاتے ہیں ان کے زنگ خوردہ ہونے کی علامت یہ ہے کہ انسان عقائد میں کمزور اور عبادات و معاملات میں لاپرواہی اختیار کر لیتا ہے۔ وہ "ایہہ جہان مٹھا تے اگلا کہیں ڈٹھا" کے مقولے پر عمل پیرا ہو کر اللہ کریم کی نافرمانیوں کو شعار بنا لیتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص خدانخواستہ ظاہری حواس سے محروم ہو جائے۔ تو وہ گوشت کا ایک لوتھڑا بن کر رہ جائے گا۔ اور زندگی وبال بن کر رہ جائے گی۔ اسی طرح اگر کسی شخص کی روح کے حواسِ خمسہ (لطائف) معطل ہو جائیں تو اس کی ساری روح بے کار ہو جائے گی چونکہ قبر اور آخرت میں جسمانی کی بجائے روحانی زندگی کا عمل دخل ہو گا۔ اس لئے روح کے کثافت آلودہ ہونے کے نتیجہ میں اُخروی زندگی مصیبت بن کر رہ جائے گی۔ اس کثافت کو لطافت میں بدلنے کی واحد دوا اللہ کا ذکر ہے۔ اور وہ بھی ذکرِ دائمی۔ "اللہ ربّ ذوالجلال کا وہ اسم ذاتی ہے جس کے ذکر سے شیشہ ہائے لطائف سے کثافت دھلتی اور چمک پیدا ہوتی ہے اور جب یہ شیشے پوری طرح منوّر ہو جاتے ہیں۔ اس وقت دل کبر و حسد، جور و ستم حرص و آز، لوٹ کھسوٹ اور خود غرضی کی بجائے عجز و خدا ترسی، ہمدردی و خیر خواہی، ایمان داری و دیانتداری ایثار و مروّت، حلم و تحمل، صبر و قناعت اور رضاء توکل کے اجالوں سے جگمگا اُٹھتا ہے۔ القصہ نفسِ امارہ نفسِ مطمئنہ میں تبدیل ہو جاتا ہے اوامر کی پابندی اور نواہی سے اجتناب کا احساس کارفرما ہو کر دریائے دل میں حبِّ الٰہی کے جذبات موجزن ہو جاتے ہیں جس کے باعث ایمانِ کامل اور یقین محکم نصیب ہوتا ہے۔ اور شریعت پر چلنا آسان تر ہو جاتا ہے چنانچہ میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ ذکر اللہ ہو کی انقلاب آفرین تاثیر سے ہزاروں فسق و فجور میں مبتلا لوگوں کو صدقِ دل سے گناہوں سے توبہ کی توفیق نصیب ہوئی اور اب ان کی زندگی تقویٰ و عبادت کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہے اور یہی وہ تزکیۂ باطن ہے جس سے دینوی و اُخروی فلاح و شاد کامی وابستہ ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"بے شک بامراد ہو گیا وہ شخص جس نے اپنے آپ کو (برائیوں سے) پاک کر لیا، اپنے ربّ کے نام کا ذکر کرتا رہا اور نماز ادا کرتا رہا۔"

گویا تزکیۂ باطن اور ذکرِ اسم ذاتِ الٰہی لازم و ملزوم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام سلاسل میں ذکرِ اسم ذات کو تصوّف کے قصرِ رفیع الشان کی اساس ٹھہرایا گیا ہے چونکہ قرآن پاک میں "ذکرِ کثیر" کا حکم دیا گیا ہے

اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے ذکر کی کونسی صورت اختیار کی جائے کہ کام کاج میں مصروف رہتے ہوئے بھی اللہ کی یاد نصیب رہے یوں تو نماز، تلاوت اور دیگر اوراد وظائف ذکر کی ذیل میں ہی آتے ہیں۔ مگر یہ تمام تر ذکرِ لسانی سے متعلق ہیں اور ذکر لسانی کو ہر حال اور ہر آن جاری نہیں رکھا جاسکتا۔ اسی لئے صوفیائے کاملین نے ذکرِ کثیر بہ طریق ذکرِ خفی اپنانے کی تلقین کی ہے جیسے بہ روایت ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ذکرِ لسانی پر ستر گنا فضیلت حاصل ہے۔ اور ذکرِ خفی میں بھی ذکرِ پاس انفاس (سانس کی اس طرح نگرانی کرنا کہ اندر جاتے ہوئے "اللہ" اور باہر نکلتے ہوئے "ھو" کہے) کی مشق کرائی جاتی ہے۔ جب یہ ذکر راسخ ہو جاتا ہے۔ تو انسان کسی لمحہ بھی اللہ کے ذکر سے غافل نہیں ہو پاتا۔ "ہتھ کار ول تے دل یار ول" کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اٹھتے، بیٹھتے، چلتے پھرتے، سوتے جاگتے۔ ذکر جاری رہتا ہے۔ اور روح انسانی کے حواسِ خمسہ یعنی لطائفِ قلبی، روحی سری، خفی اور اخفاء بلکہ جسم کا رنگ رنگ، بال بال، خون کا قطرہ قطرہ ذاکر اور منور ہو جاتا ہے۔ بقول حضرت سلطان باہوؒ ۔ ے

ج جنہاں عشق حقیقی پایا مونہوں نہ کجھ الاون ہو
ذکر فکر وچ رہن ہمیشہ دم نوں قید لگاون ہو
سری، قلبی، روحی، سودی، اخفا، خفی کماون ہو
میں قربان تنہاں توں باہو جیڑے اکس نگاہ جگاون ہو

لطائف کے منور ہونے تک سارا تصوف ہے جس سے تزکیہ باطن کرنا مقصود رہے۔ اس سے آگے سلوک کی منزل شروع ہوتی ہیں۔ تصوف کی اصطلاح میں سلوک سے مراد روح کا سفر ہے شیخ اپنی توجہ سے مرید کی روح کو پکڑ کر آسمانوں اور عالم ملکوت سے گزارتا مقام احدیت، مقام معیت اور مقام اقربیت تک لے جاتا ہے اس سے آگے فنا فی اللہ، بقا باللہ اور پھر سالک المجذوبی کی منازل سے گزارتا عرشِ معلیٰ یعنی عالم جبروت میں داخل کرتا ہے۔ نویں عرش کے اختتام پر عالم امر کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ ساری منازل وراء الوراء ہیں اور ان میں قدم رکھنا محض اللہ کے فضل پر موقوف ہے لیکن یہ صورت کسی مردِ کامل کی راہنمائی اور "توجہ" کے بغیر ناممکن ہے۔ اس کی مثال یوں لیجیئے کہ ایک عمارت میں بجلی کی وائرنگ ہو چکی ہو۔ اعلیٰ قسم کے بلب بھی لگا دیئے گئے ہوں مگر جب تک واپڈا والوں سے بجلی کا کنکشن نہیں ملتا وہ تاریکی ہی میں ڈوبی رہے گی بعینہٖ روحانی دنیا میں فیض کا منبع (پاور ہاؤس) رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سینہ مبارک ہے۔ جس مردِ کامل نے روحانی منازل طے کرتے ہوئے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دربارِ مقدسہ میں رسائی حاصل کرلی۔ اس کے سینے میں فیض کا تار جوڑ دیا گیا۔ اب اس کے سینے سے فیض کی تاریں نکلیں گی اور وہ مریدوں کے قلوب کو منور کریں گی۔ اس مقام کے حامل سالک کو تصوف کی اصطلاح میں "فنا فی الرسول" سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ایسے شخص کی ظاہری زندگی شریعت کے سانچے میں ڈھلی ہوتی ہے۔ اور روحانی طور

پر وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دربارِ عالیہ میں حاضر باش ہوتا ہے۔ جب تک سالک کو دربارِ نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں رسائی حاصل نہ ہو تب تک اس کی روح میں منازلِ بالا کی طرف جادہ پیما ہونے کی قوت ہی پیدا نہیں ہو سکتی۔

یہاں یہ وضاحت بے جا نہ ہوگی۔ کہ بیعت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک بیعتِ شریعت اور دوسری بیعتِ طریقت۔ بیعتِ شریعت تو یہ ہے کہ کسی بزرگ کو آپ نے دیندار پایا اس سے متاثر ہوئے اور آپ نے اس سے بیعت (عہد) کی کہ میں اپنی زندگی اللہ تعالےٰ اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے پر گذاروں گا۔ اس نے چند اوراد، وظائف بتا دئے اور آپ ان پر کاربند ہو کر کس قدر شریعت پر عمل پیرا ہو گئے۔ اتنا بھی غنیمت ہے کہ کس قدر شریعت پر چلنا نصیب ہو گیا۔ مگر اخلاص اور احسان کی کیفیت ناپید رہتی ہے۔ اور عموماً یہی وہ بیعت ہے جو آج کل مختلف پیر خانوں میں رائج ہے۔ رہا بیعتِ طریقت کا معاملہ تو یہ بہت ارفع چیز ہے۔ جہاں اس پر چلانے کی اہلیت رکھنے والے خال خال ہوتے ہیں۔ وہاں اس پر چلنے کی آرزو دل میں پالنے والے بھی شاذ ہی ہوتے ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھ لیجیے کہ قصرِ صدارت میں جا کر جناب صدر سے شرفِ ملاقات کرنا بڑے فخر کی بات ہے۔ مگر ملک کی آٹھ کروڑ آبادی میں کتنے لوگ ہیں جن کے دل میں یہ خیال آتا ہو کہ چلو قصرِ صدارت میں جا کر صدر صاحب کا نیاز حاصل کیا جائے۔ یہ سوچ اور خواہش اس لئے پیدا نہیں ہوتی کہ ہر کوئی جانتا ہے۔ کہ بھلا میں قصرِ صدارت میں کیسے بار پا سکتا ہوں۔ اسی طرح روحانی طور پر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں رسائی حاصل کرنے کی آرزو بھی اس لئے لوگوں کے دلوں میں پیدا نہیں ہوتی کہ وہ خیال کرتے ہیں کہ ع

کہاں میں کہاں وہ مقام اللہ اللہ

سو ایسے صاحب عزم لوگ بہت کم ہوتے ہیں جن کے دلوں میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دربارِ عالیہ میں رسائی حاصل کرنے کی تمنا اور حوصلہ پیدا ہو۔ اور وہ اس منزل کے حصول کے لئے کسی مردِ کامل کی تلاش میں سرگرداں اور کٹھن گھاٹیوں سے گزرنے کی اہمیت رکھتے ہوں۔ وہ چند اوراد پر ہی قناعت کر لیتے ہیں اور بے چارے نہیں جانتے کہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہو سکتا ہے سے

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

یوں تو قریہ قریہ خود ساختہ غوث قطب اور مدعیان طریقت موجود ہیں۔ مگر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دربارِ عالیہ میں پہنچانا اور منازلِ بالا میں چلانا تو درکنار وہ اپنے مریدین کے لطائف منور کرانے کی استعداد اور اہلیت سے بھی عاری ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے ہی حضرت سلطان باہوؒ کا قول ایک آئینہ ہے "کہ فقیر فنافی اللہ صاحب حضور ہوتا ہے مجلسِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں پہنچانا اس کے لئے مشکل نہیں ہوتا۔ اور جس کو یہ قدرت نہ ہو وہ کامل نہیں راہزن ہے۔" سو علمائے ظاہر دین کے ظاہری پہلو کے امین ہیں۔ جبکہ صوفیائے کرام

(باقی ۲۵ پر)

ابو سعید

آزادی کا المیہ

دنیا دار المحن ہے تکلیفوں کا گھر ہے مصائب کی آماجگاہ ہے ایک صاحب دل نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اگر مصیبت نہیں آتی تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ دنیا کی خاصیت کیسے بدل گئی مگر مصائب کے کئی درجے ہوتے ہیں کوئی معمولی درجے کی مصیبت کوئی بہت بڑا صدمہ چنانچہ ہماری یہ مصیبت زدہ قوم اسی قانون تکوینی کے تحت ہمیشہ مصائب کا نشانہ بنتی رہی مگر اسے سب سے بڑا صدمہ اس وقت ہوا جب صدیوں کی غلامی کے بعد اسے آزادی مل گئی سفید فام آقا تو چلے گئے مگر یوں جیسے مکڑی اڑ جاتی ہے اور پونگ چھوڑ جاتی ہے۔ اور پونگ کی تباہ کاریوں سے کون واقف نہیں یہ ایسا صدمہ تھا کہ قوم سوگ منانے لگی اور مناتی چلی جا رہی ہے، اس صدمے سے قوم کی زندگی کا ہر شعبہ بری طرح متاثر ہوا لہذا ہر شعبہ میں سوگ منانے کا پورا پورا اہتمام کیا گیا مثلاً

۱۔ **تعلیم:** ہمارے بدیشی آقاؤں نے یہ راز پا لیا تھا کہ نظام تعلیم اور نصاب تعلیم وہ واحد ذریعہ ہے جس سے کسی قوم کی فکری اور عملی زندگی میں انقلاب لایا جا سکتا ہے۔

اگر اس سے غلام قوم کی دینی حمیت، قومی غیرت مذہبی روایات سے دلچسپی کو ختم کر دیا جائے تو غلامی پر ایسی مطمئن ہو جائے گی کہ ؎

خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوق نخچیری

کی کیفیت پیدا ہو جائے گی چنانچہ میکالے کے فتنہ پرور دماغ نے تعلیم کا ایسا فارمولا تیار کر لیا کہ اس کے اثر سے قوم کے جسم تو وطن میں رہیں گے مگر ان کے دماغ ہر اس فلسفے کو قبول کرنے کے لئے تیار ہوں گے جو ان کے دین مذہب اور قومی روایات کو حقیر غیر مہذب اور غیر انسانی ثابت کر دے چنانچہ میکالے کا تیر نشانہ پر بیٹھا اور قوم کو اپنے دین سے وطن سے اپنی روایات سے نفرت ہونے لگی اور بدیشی آقاؤں کی نقالی کو تہذیب کا معراج سمجھا گیا

آزادی ملنے پر قوم کے کانوں میں دبی دبی یہ آواز تو آتی رہی کہ ؎

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

مگر صدمے کا اثر یہ تھا کہ آزادی کے ربع صدی گذرنے کے باوجود نظام تعلیم میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے

کے لیئے کوئی داعیہ ہی پیدا نہ ہوا حتیٰ کہ ذریعہ تعلیم کے لیئے اپنی زبان اختیار کرنا بھی گوارا نہ کیا گیا، پھر جو کچھ ارتعاش پیدا ہوا تو نظام تعلیم کا جوں کا توں برقرار رکھتے ہوئے نصاب تعلیم میں اسلامیات کا مضمون شامل کر دیا جس کی حیثیت بالکل یہ ہوگی کہ ؎

نئی تہذیب میں بھی مذہبی تعلیم شامل ہے
مگر یونہی کہ جیسے آب زمزم مے میں شامل ہے

یہ تعلیم کا ایک پہلو ہے دوسرا پہلو وہ ہے جس کے متعلق قوم بڑی مستی میں اگر گنگناتی ہے ؎

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت

مگر عورتوں کو تعلیم وہی دی جا رہی ہے کہ وہ زن نہ رہیں اگر کوئی کمی رہ گئی تو ہر درجے میں مخلوط تعلیم کا ایسا اہتمام کیا گیا کہ عورت میں عورت ہونے کا احساس تک ختم ہو جائے۔

پھر تعلیم کا ایک اور پہلو اس سے بھی زیادہ پُر بہار اور پُر کیف ہے۔ آزادی ملتے ہی ہر گلی، ہر کوچے ہر موڑ پر انگلش میڈیم سکول نظر آنے لگے جیسے برسات میں گھورے ڈھیر پہ پدپھڑے سر نکالتے نظر آتے ہیں تعلیم کے میدان میں آزادی کے سوگ منانے کی انتہا ہے، یعنی قوم نے اپنے سابقہ آقاؤں کو یقین دلا دیا کہ تم تے اپنے دور میں اپنی زبان سکھانے کے لیئے پانچویں جماعت سے ابتدا کرنا مناسب سمجھا تھا مگر قوم تمہارے فراق میں تمہاری یاد تازہ رکھنے کے لیئے اتنا صبر نہیں کر سکتی کہ اس کے نونہال چار سال تک اپنے آقاؤں سے بے خبر رہ کر گزار دیں گویا قوم پورے شعور للہ پورے اہتمام کے ساتھ تعلیم کے میدان میں آزادی کا سوگ منا رہی ہے اور ۳۵ برس گذر جانے کے باوجود آزادی کے گھاؤ مندمل ہونے نہیں پائے

تہذیب و ثقافت:

ہر قوم کی تہذیب اس کے قومی تشخص کا بنیادی اور واحد ذریعہ ہوتا ہے۔ تہذیب کے عناصر ترکیبی زبان لباس، رہائش، باہمی برتاؤ اور تفریحی مشاغل وغیرہ سمجھے جاتے ہیں قوم نے زندگی کے اس پہلو میں بھی آزادی کا سوگ منانے میں کوئی کمی نہیں ہونے دی۔

اپنی زبان استعمال کرنا غیر مہذب ہونے کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ غلامی کی یادگار سفید فام آقاؤں کی زبان بولنا، لکھنا علم و فضیلت اور عظمت کا نشان ہے ؎

اک پیر نے تہذیب سے لڑکی کو سنوارا
اک پیر نے تعلیم سے لڑکے کو ابھارا
پتلون میں یہ تن گیا وہ سایہ میں پھیلی
پاجامہ غرض یہ ہے کہ دونوں نے اتارا

غلامی کے لباس میں یوں مگن نظر آتے ہیں کہ بے اختیار کہنے کو جی چاہتا ہے ؎

واہ کیا دھج ہے میرے بھولے کی
شکل کوئلے کی ہیٹ سولے کی

رہائش کے سلسلے میں ایک اصول کار فرما ہے کہ آرام کا خیال کم "شو" کی فکر زیادہ ـــ

جہاں تک باہمی برتاؤ کا تعلق ہے جو جس مقام پر ہے فرعونِ بے ساماں بنا ہوا ہے وہی کرّوفر وہی رعونت نہ باہمی شفقت نہ اخوت نہ یگانگت نہ اپنائیت۔

رہی بات تفریحی مشاغل کی تو عارفِ لاہوری کی بات یاد آتی ہے ؎

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

البتہ اس میں اتنی تبدیلی نظر آتی ہے کہ قوم نے یہ نظریہ بدل دیا ہے اور نیا نظریہ پیش کیا ہے اور اسے اتنا عام کیا ہے کہ پرانا نظریہ حافظہ سے محو ہو کے رہ گیا۔ نیا نظریہ یہ ہے کہ ؎

آ میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے
طاؤس و رباب اول طاؤس و رباب آخر

اس نظریہ کی پذیرائی کا یہ عالم ہے کہ قوم کی ثقافت کی نمائندگی کے لیے جو طائفے غیر ممالک میں جاتے ہیں وہ طاؤس و رباب سے یا رقص و سرود سے اپنے فن کا اور اپنی قومی ثقافت کا اظہار کرتے ہیں اس پر مستزاد یہ کہ قومی ایوارڈ، خطاب اور تمغے انہی فن کاروں کو دئے جاتے ہیں تاکہ قومی ثقافت اور چونکہ یہ سب کیا ہے تہذیب و ثقافت کے سلسلے میں قوم آزادی کا سوگ منا رہی ہے

حکام اور عوام: دورِ غلامی میں مغربی آقاؤں نے ی۔س۔ا اور ی۔س۔پ افسروں کو تربیت دینے کا وہ دستور تیار کیا تھا کہ بندہ و آقا کے درمیان ایک طرف پستی اور کمتری کے احساس کو تقویت دی جائے، دوسری طرف کرّوفر، اختیار اور عوام کے لیے حقارت کے جذبات کو خوب ترقی دی جائے تاکہ حکام اور عوام میں یہ یقین پیدا ہو جائے کہ دونوں مختلف قسم کی مخلوق ہیں۔ ایک علوی دوسرا سفلی، چنانچہ اس کیفیت میں اگر اضافہ نہیں ہوا تو کمی بھی کہیں نہیں ہوتی، ایک ہی قوم کے افراد ہوتے ہوئے باہمی معاملات میں اب بھی دو مختلف قسم کی مخلوق معلوم ہوتی ہے اتنا فرق ضرور ہے کہ گورے صاحب نے کرسی خالی کی تو اس پر کالا صاحب بیٹھ گیا اور آزادی کا سوگ منایا جا رہا ہے۔

حکومت: دورِ غلامی کی بات ہے ایک دل جلے نے انگریز افسر شاہی کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہا تھا۔

دفتر اور کچہریاں ظلم کے دربار ہیں
ڈاکوؤں کے غار ہیں
لے اڑیں جو جان کو دین کو ایمان کو
ملیں اس آن بان کو
دیکھتا چلا گیا

یہ غلامی کے زمانے کی بات تھی اب تو آزادی ہے ظلم کے دربار اجڑ گئے ڈاکو اپنے غاروں میں چھپ گئے، اب تو نہ جان کا خوف نہ دین کا خطرہ نہ ایمان کی فکر، یہ اور بات ہے کہ دورِ غلامی میں "ڈالی" سے کام نکلتے تھے اب اس غیر ملکی یادگار کو مٹا کر خالص قومی فارمولا تیار کر لیا گیا ہے اور وہ ہے "تمک مکا"، اگر اس نعمت غیر مترقبہ کو حاصل کر لیا تو جان کا خطرہ ہے نہ ایمان کا ظلم کا گذر نہ ڈاکے کا اندیشہ اصول "تنگ مکا" زندہ باد شاد باش اے قوم جان و ایمان سے بے فکر ہو کر آزادی کا سوگ مناتی چلی جا۔

طرز حکومت: حصول آزادی کے وقت قوم نے ایک نعرہ اپنایا کہ

پاکستان کا مطلب کیا؟ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

اور لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا مطلب کیا؟ کہ اس ملک میں قانون صرف اللہ کا چلے گا۔ چلائے گا کون؟ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ پر یقین و ایمان رکھنے والے وہ کہاں سے ملیں گے؟ یہ سوال ٹیڑھا ہے اپنے جانے والے سفید فام آقاؤں سے پوچھو، جواب ملا بالغ رائے دہندگی کے اصول پر انتخاب کا انتظام کرو اللہ کا قانون چلانے والے خود سامنے آجائیں گے۔

قوم کو نسخہ کیمیا مل گیا اور خوشی میں جھوم جھوم کر کہنے لگی "گاؤ خوشی کے گیت ہو۔ گاؤ خوشی کے گیت"

اس نشے میں قوم ایسی مدہوش ہوئی کہ عقل و خرد کا دیوالہ نکل گیا۔ وہ کیسے؟

قوم نے مریضوں کی صحت اور علاج کے لئے ڈاکٹروں کا انتخاب کیا تو مریضوں سے نہیں پوچھا کہ بتاؤ تمہارے لئے کونسا ڈاکٹر مقرر کیا جائے، بلکہ ماہرین فن سے رائے لے کر ڈاکٹر کا انتخاب کیا، کیونکہ جان اور صحت کا نازک معاملہ تھا۔ قوم نے کالج کی تعلیم کے لیے پروفیسروں کا انتخاب کیا تو طالبعلموں سے رائے نہیں پوچھی کہ کسے تمہارا استاد مقرر کیا جائے بلکہ پبلک سروس کمیشن کے صائب الرائے ارکان سے رائے لے کر پروفیسر کا انتخاب کیا۔

قوم نے اپنی فوج کے لیے کیڈٹ کا انتخاب کرتے وقت سپاہیوں سے رائے نہیں لی کہ کسے تمہارا افسر مقرر کیا جائے، بلکہ فنون جنگ کے ماہرین سے رائے لے کر کیڈٹ کا انتخاب کیا بلکہ انتخاب در انتخاب کے لئے SSB کے ارکان سے رائے لینا ضروری سمجھا کیونکہ ملک کی حفاظت کا معاملہ تھا۔

قوم نے انجینئر مقرر کرتے وقت مزدوروں اور مستریوں سے رائے نہیں لی کہ کون تمہارا انجینئر ہونا چاہیے بلکہ ماہرین فن کی رائے لے کر انجینئر مقرر کیا کیونکہ مکانات اور پلوں کی تعمیر کا مسئلہ بڑا نازک ہے۔

قوم نے جج مقرر کرتے وقت مقدمہ بازوں سے رائے طلب نہیں کی کہ کون تمہارا جج مقرر کیا جائے بلکہ ماہرین قانون لوگوں سے فیصلہ طلب کیا، کیونکہ انصاف کا معاملہ بڑا نازک ہے۔

قوم نے S.P مقرر کرتے وقت چوروں اور ڈاکوؤں سے رائے طلب نہیں کی بلکہ ماہرین فن سے پوچھا۔ کیونکہ قانون کا احترام کرنا اور احترام کرانا ہی مملکت کے بقا کا باعث ہے۔

دیکھ لیجئے زندگی کے ہر شعبے میں قوم نے کتنی دانشمندی کس قدر احتیاط اور کتنے احساس ذمہ داری سے کام لیا لیکن تضاد ملاحظہ ہو یوں لگتا ہے جیسے قوم کو سفید فام آقاؤں کے فراق میں ایسا دھچکا لگا کہ مت ہی ماری گئی اللہ کا قانون نافذ کرنا، اسلامی حکومت کا نظم نسق چلانا، اتنا بیکار غیر ضروری ناقابل التفات اور گھٹیا کام ہے کہ اس نظام کو چلانے کے لیے انتخاب کرتے وقت رائے لی جاتی ہے تو چوروں سے، مفروروں سے ڈاکوؤں سے شرابیوں سے، اوباشوں سے جاہلوں سے گنواروں سے جرائم پیشہ لوگوں سے بلکہ اس بازار کے باسیوں سے

اور "ستاد جیوں" سے ہاں صرف اتنی احتیاط ملحوظ رکھی جاتی ہے کہ وہ بالغ ہوں کیونکہ آقاؤں سے یہی سبق پڑھا تھا۔

اسی پر بس نہیں۔ اسلامی نظام چلانے کے لئے آدمی کا انتخاب کرتے وقت ایک چور کی رائے کا اتنا ہی وزن ہوگا جتنا سپریم کورٹ کے جج کی رائے کا ایک شرابی کی رائے کی وہی قیمت ہوگی جو ایک دیندار زاہد وعابد کی رائے، ایک اَن پڑھ گنوار کی رائے اتنی وقیع ہوگی جتنی ملک کے صدر کی رائے اس بازار کی ایک بائی کی رائے اتنا وزن رکھتی ہے جتنا کسی دارالعلوم کے ایک مفتی کی۔

بھیڑوں کے ایک چرواہے کا ووٹ اتنا ہی قیمتی ہے جتنا ایک پی ایچ ڈی پروفیسر، ایک مہتری شیئر کی رائے کا اتنا ہی وزن ہے جتنا ایک آئی جی پولیس کا، ایک خاکروب کی سوچ اور ایک جرنیل کی سوچ انتخاب کے پلڑے میں برابر ہے اور یہ سب اس لیئے کہ ایک چور ایک ڈاکو ایک جرائم پیشہ ایک مہتری شیئر ایک گنوار ایک چرواہا ایک خاکروب اسلامی نظام اور اللہ کے قانون سے اتنا ہی واقف ہے جتنا کوئی پروفیسر کوئی مفتی کوئی جج، کوئی آئی جی یا ملک کا صدر اس فن سے واقف ہے اس لئے سب کی رائے ایک جیسا وزن رکھتی ہے، بھلا اللہ کا قانون اور اسلامی نظام کونسا ایسا پیچیدہ فن ہے کہ کوئی اس سے واقف نہ ہو، بہر حال یہ قوم کھیل کھیلتی چلی آئی ہے اور اب بھی کھیلنے کے لئے تیار ہو رہی ہے مگر قوم کو یہ احساس نہیں دور غلامی میں جب یہ کھیل کھیلا گیا تھا اسکی حقیقت یہ تھی کہ ؎

اس کھیل میں تعیین مراتب ہے ضروری
شاطر کی عنایت سے تو فرزیں میں پیادہ
بیچارہ پیادہ تو ہے اک مہرۂ ناچیز
فرزیں سے بھی پوشیدہ ہے شاطر کا ارادہ

مگر اب یہ کھیل نہیں بلکہ بہت بڑی ذمہ داری ہے جن کے اثرات یہاں بھی محسوس ہونگے اور مرنے کے بعد بھی اس کی پرسش ہوگی کہ اللہ کا قانون کوئی ایسی حقیر شے تھی کہ تم اسکے نفاذ کے لیئے آدمیوں کا انتخاب کرتے وقت (ماہرین کی رائے) کا اصول بالکل بھلا دیا زندگی کے اس پہلو میں قوم باقاعدہ اہتمام سے آزادی کا سوگ منا رہی ہے اور شاید مناتی چلی جائے گی مگر اس سے پہلے ایک تجربہ کرنے کی دعوت دینے کی گستاخی کرتا ہوں۔

فوج میں جرنیل اور بریگیڈیئر انتخاب کرتے وقت سپاہیوں، خاکروبوں اور ریکروٹوں سے ووٹ حاصل کرنے کا تجربہ کر لیا جائے۔ پھر دیکھ لیا جائے کہ ایسے جرنیلوں کی کمانڈ میں فوج کیا گل کھلاتی ہے۔

ڈاکٹروں کا تقرر مریضوں سے ووٹ لے کر، جج اور مجسٹریٹ کا تقرر مقدمہ بازوں سے پوچھ کر، آئی جی کا تقرر مفروروں اور جرائم پیشہ لوگوں کی صوابدید پر اور خطیب کا تقرر اس بازار کے باسیوں سے پوچھ کر کیا جائے، اس انتخاب کا تجربہ تو قوم کرتی آ رہی ہے ذرا اس انتخاب کا تجربہ بھی ہو جائے۔ سنید خام آقاؤں کے بتائے ہوئے اس طرز انتخاب کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا اور ہونا چاہیئے کہ

ملک کی آبادی میں ڈاکٹر، وکیل، پروفیسر، علماء جج اور پڑھے لکھے لوگوں کی اوسط زیادہ سے زیادہ ۲۰٪ ہوگی۔ ان میں سے اسلامی نظام اس کے تقاضوں اللہ کا قانون اور اس کی پیچیدگیوں کو سمجھنے والے نصف کے قریب فرض کر لیجئے یعنی ستر اسی فیصد وہ لوگ ہیں جو اس کوچہ سے واقف ہی نہیں، نمائندوں کا انتخاب ان ستر اسی فیصد ووٹروں کی رائے سے ہوگا تو عقل کا فیصلہ کیا ہے ان کے منتخب کردہ نمائندے اسلامی نظام حکومت چلانے کے اہل اور اللہ کا قانون نافذ کرنے کے قابل ہوں گے، زہریلے دودھ کو بلو کر جو مکھن نکالا جاتا ہے وہ شفا بن جاتا ہے ظاہر ہے کہ سیر بھر دودھ کا زہر سمٹ کر چھٹانک مکھن میں آگیا۔ اور یہ صرف فرضی فارمولا نہیں ماضی میں قوم اس فارمولے کو آزما چکی ہے لطف کی بات ہے کہ کچھ قوم یہ غیر عقلی غیر منطقی بلکہ غیر انسانی طرز انتخاب کی دلدادہ بھی ہے اور اصولی طور پر یہ یقین بھی رکھتی ہے کہ بقول

از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

مگر یہ تضاد کیونکر رفع ہو جب قوم کے لئے آزادی کا سوگ منانا ضروری ٹھہرا۔

قانون ساز: سفید فام آقاؤں نے اپنے غلاموں کو غلامی میں پختہ تر کرنے کے لئے ان کی عزت نفس کو ختم کرنے اور ان کو اسلامی اقدار اور اخلاق سے متنفر کرنے کے لئے جو قانونی ڈھانچہ تیار کیا گیا تھا اس کی تکمیل کر کے اسے تیار کردہ شاگردوں کے حوالے کر دیا اور وہی اس میراث کے جائز وارث ٹھہرے، قوم نے شروع میں لا الہ الا اللہ کا نعرہ لگا کر یہ تاثر دیا کہ بہت جلد یہاں کافرانہ قانون کی عملداری ختم کر کے اللہ کا قانون نافذ کر دیا جائے گا مگر سوال یہ تھا کہ نافذ کرے گا کون؟ انگریز جو بطور باقی ذہنی اور قانونی فصل تیار چھوڑ گیا تھا اسے اللہ کا قانون کسی طرح سوٹ نہیں کرتا تھا نصف صدی تک اس اجنبی بلا کو ٹالنے کی کوشش میں صرف ہو گئے اسلام دیکھتا رہا اور مسلمان آزادی کا مسلسل سوگ مناتے ہوئے بدیشی قانون کا جوا گلے سے اتارنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔

قانون کے پرسکون سمندر میں ہلکی ہلکی موجیں اٹھنا شروع ہوئیں بالآخر اللہ کا قانون بننا شروع ہو گیا رہا نافذ کرنا تو اس کے لئے اصول تدریج رکاوٹ بن گیا یعنی ماحول سازگار نہیں جب سازگار ہو گا تو قانون الٰہی نافذ کر دیا جائے گا، جیسے کوئی ڈاکٹر کسی مریض سے کہے ابھی حالات سازگار نہیں جب تمہیں صحت ہو جائے گی میں تمہیں دوا پلا دوں گا۔ قانون کی ضرورت ہی اخلاقی بیماریوں کے علاج کے لئے ہے مگر قوم کے دانشور کہتے ہیں، جب قوم صحت مند ہو جائے گی تو قانون الٰہی کا تریاق پیش کر دیا جائے گا مگر بایں ہمہ۔ اتنی بات ضرور ہوئی ہے قانون کے عظیم الشان کلاک کے پنڈولم پر ایک چٹ لگا کر اس پر قانون شریعت لکھ دیا گیا ہے، پنڈولم کی حرکت وہی رفتار وہی، اندر کی گراریاں وہی پرزے وہی ان کی حرکت وہی اور ظاہر ہے کہ نتیجہ بھی وہی ہونا چاہیے مگر جب کبھی قانون شریعت کے نفاذ کا خیال آجائے

تو پنڈولم کی چپی پر نگاہ کر کے قوم مطمئن ہو جاتی ہے کہ اگر پنڈولم حرکت کر رہا ہے تو شریعت کی چپی اس پر لگی ہوئی ہے گویا اس پہلو میں بھی قوم کا ماٹو یہ ہے کہ

گزارے تھے غلامی میں جو لمحے
انہی کی یاد میری زندگی ہے

اور یہ کتبہ اٹھائے قوم برابر آزادی کا سوگ منا رہی ہے۔

ذرائع ابلاغ: ذرائع ابلاغ میں ریڈیو اور ٹی وی بڑی اہمیت کے حامل ہیں یہ صرف ذریعہ اظہار نہیں سامان عیش و طرب ہی نہیں، بلکہ ذریعہ تعلیم تبلیغ دین اور اخلاقی تربیت کا ذریعہ ہیں مگر قوم نے ان سے صرف عیش و نشاط کا کام ہی لیا ہے، گندے اور فحش فلمی گانے جنسی جذبات کو ابھارنے والے نغمے اور گیت بدلتے ہوئے عنوانوں کے ساتھ پیش کئے جاتے رہے، ٹی، وی پر انگریزی فلموں کی بھر مار رہی مگر جس طرح نصاب تعلیم میں اسلامیات کا چھوٹا سا پیوند لگا دیا گیا ہے اسی طرح ریڈیو ٹی وی پر بھی تلاوت قرآن، الھدیٰ، نعت رسول مقبولؐ کے عنوان بھی سامنے آنے لگے مگر صورت حالات یوں سامنے آتی رہی کہ تلاوت قرآن اور نعت رسول مقبولؐ کے بعد جتنا جلد ممکن ہو سکا، جنسی جذبات کو ابھارنے اور پیار کا درس دینے کے لیے "جمہ جتی بال کے بنیرے اتے کھی آں" اور "جب پیار کیا تو ڈرنا کیا" قسم کے گانے شروع ہو گئے، جیسے رقص و سرود کی محفل کا افتتاح تلاوت قرآن سے کیا جاتا لگا۔

حکمت قرآن بیان کرنے کا اہتمام بھی کیا گیا مگر جب چادر اور چار دیواری کے تحفظ کے لیے قرآنی نسخہ بیان ہوا تو بیگمات بنگلوں سے نکل آئیں اور مستورات نے بکشوفات کا روپ دھار کر احتجاجی جلوس کی شکل میں سڑکوں پر زندہ باد اور مردہ باد کے نعرے لگانے شروع کر دیئے، یعنی ہم ابھی خاصی آزادی کا سوگ منا رہی تھیں تم نے خواہ مخواہ اللہ کی باتیں سنا کر ہمارا مزہ کرکرا کر دیا، یعنی اعلان کر دیا کہ لاالٰہ الا اللہ کا مطلب یہ کب تھا کہ سچ مچ اللہ کی بات ہی اس ملک میں چلے گی۔ یہاں تو اس قسم کا سماں ہونا چاہیے کہ

الفت زیبا بھی ہے دل میں بتوں کی چاہ بھی
کہتے جاتے ہیں مگر منہ سے معاذاللہ بھی

تمہیں اگر تلاوت قرآن کرنا ہی ہے تو اس کی صورت صرف یہ ہے کہ

اب تو میوزک ہال میں قرآن گایا کیجئے
اور آزادی کا سوگ منانے کے سلسلے میں ہماری راہ میں حائل ہونے سے اجتناب کیجئے۔

جشن منانا: قوم کی زندگی کا ہر گوشہ جب تضاد کا شکار ہے تو یہ پہلو کیونکر بچ سکتا ہے چنانچہ قوم نے ۳۶۴ دن سوگ منانے کے بعد ایک دن جشن منانے کا اہتمام بھی ضرور کیا، گو یہ جشن بھی دراصل سوگ ہی کی ایک صورت ہے۔

لاالٰہ الا اللہ کا پیغام دینے والے نے خوشی اور جشن منانے کا سلیقہ بھی سکھایا تھا صرف سکھایا نہیں

بلکہ ایسا اہتمام کیا تھا کہ ہر سال دو دن خوشی کے اور خوشی منانے کے لئے مقرر کئے اور سلیقہ یہ سکھایا کہ خوشی کا موقع آئے تو خوشی دینے والے کے ساتھ قلبی اور عملی تعلق پختہ تر ہو جائے عام دنوں میں اپنے محبوب کی ملاقات اور اظہار شکر کے لئے تم پانچ مرتبہ اس کے حضور پیش ہوتے ہو تو خوشی کے روز چھ دفعہ یہ ملاقات ہونی چاہیے تاکہ اس سے تعلق گھٹنے نہ پائے،

مگر سفید فام آقاؤں نے خوشی منانے کا سلیقہ یہ سکھایا کہ ناچو، کودو گاؤ اور ہلڑ بازی کرو۔ تمام اخلاقی اور انسانی حدود و قیود کو بھلا کر۔

تصنع بناوٹ، نام نمود شہرت اور شو کا پورا پورا اہتمام کرو۔ چنانچہ قوم نے ایک دن اس امر کے لئے مختص کر دیا کہ لاکھوں روپے کے ضیاع سے رات بھر ضیا پاشی کرو جلوس نکالو، ناچو، کودو، گاؤ، چنانچہ قوم نے پورے اہتمام سے لا الٰہ الا اللہ کے تقاضوں کو پس پشت ڈال کر آزادی کا سوگ مناتے ہوئے اپنے آقاؤں کی یاد میں ایک روز جشن منانے کی ایکٹنگ بھی کر لی مگر قوم زبانِ حال سے کہتی رہی کہ ؎

دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

آہ! اے خود فراموش اور زیاں کوش قوم، سوچ کہ یہ اُفتاد کہاں سے پڑی۔ اس کی صرف ایک ہی وجہ ہے کہ ؎

مسلم از سرِ نبیؐ بیگانہ شد
باز ایں بیت الحرم بت خانہ شد

تو پھر اس بے دینی اور بے یقینی کے جھاڑ جھنکار سے نجات پانا اور اس درندگی اور حیوانیت کے شکنجے سے نکلنا محال کب ہے؟ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں، ناامیدی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جبھی تو ایک دانائے راز نے کہا تھا ؎

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

مگر وہ نم کیا ہے؟ یہی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، محسنِ انسانیت، منبعِ رحمت مصدرِ ہدایت خزینۂ طمانیت سے قوم نے جو بیگانگی کی روش اختیار کر رکھی ہے ا

اسے یگانگت سے بدلنے کی تدبیر کی جائے
حضورؐ سے ناآشنائی کو شناسائی سے بدل لیا جائے
حضورؐ سے اجنبیت کو محبت میں تبدیل کر دیا جائے
حضورؐ سے بُعد کو قرب کی صورت دی جائے کیونکہ زمانہ شاہد ہے تاریخ گواہ ہے کہ حضورؐ کی تعلیمات نے وحشی اور گنوار بدوؤں کو دنیا کا رہنما اور معلم بنا کے رکھ دیا۔

حضورؐ کی تربیت نے جاہل اور اجڈ دیہاتیوں کو نوعِ انسانیت کو تہذیب سکھانے کے منصب پر لا کھڑا کیا۔

حضورؐ کی تدریس نے محکوموں کو حکومت کا ایسا گر سکھایا کہ غیر مسلم مفتوح قوم بھی ان کے انصاف اور طرزِ حکومت کو دیکھ کر یہ آرزو کرنے لگی کہ کاش ہمارے قومی حاکموں کی جگہ تم ہی ہمارے حاکم رہو

حضورؐ نے انسانیت کو وہ دستورِ حکومت دیا کہ پوری انسانی

تاریخ میں اسکی مثال نہیں ملتی۔

حضورؐ نے انسانیت کو وہ قانون دیا جسکی نظیر دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانیت کا درس دینے کے لیئے اور بندوں کو خدا سے آشنا کرنے کے لیئے تبلیغ و اصلاح معاشرہ کا وہ گر سکھایا کہ چند برسوں میں کایا پلٹ گئی ہے

درفشانی نے تیری قطروں کو دریا کر دیا
دل کو روشن کر دیا آنکھوں کو بینا کر دیا
خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

یعنی اس کشت ویراں کے لیئے نم ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شناسائی حضورؐ سے ارادت، حضورؐ سے عقیدت حضورؐ سے محبت، حضورؐ کی اطاعت اور حضورؐ سے وفاداری کا اہتمام کرنا۔

قوم کے پاس جب یہ گنج گرانمایہ اب بھی موجود ہے تو اسے بھٹکنے اور مایوس ہونے کی نوبت کیوں آئے ضرورت صرف اسی نم کے پیدا کرنے کی ہے پوری قوم اور قوم کے سربرآوردہ افراد اس نم کے پیدا کرنے کی فکر میں لگ جائیں تو صدیوں کا سفر برسوں میں طے ہو سکتا ہے۔ کیونکہ سہ

ہے یہ وہ نام خاک کو پاک کرے نکھار کر
ہے یہ وہ نام خار کو پھول کرے سنوار کر
ہے یہ وہ نام ارض کو کر دے سما ابھار کر
اکبر اسی کے عشق میں دل کو ذرا فگار کر

صل علیٰ محمدؐ
صل علیٰ محمدؐ

★۔ مجاہدہ مطلقاً مخالفت نفس کا نام نہیں بلکہ جہاں مرغوب نفس مامور بہ نہ ہو، ورنہ نفس مطمئنہ کو بعض اوقات مامور بہ کی رغبت ہوتی ہے حالانکہ اس کی مخالفت مجاہدہ نہیں۔ جعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ یقیناً دال ہے مرغوبیت صلوٰۃ پر اور ظاہر ہے کہ اس کا ترک مطلوب نہیں اور مامور بہ ہوناتو یہ وحی سے معلوم ہو گا تو معلوم ہوا کہ مجاہدہ کا محل وحی سے متعین ہوگا نہ کہ محض رغبت یا عدم رغبت سے۔ (ا۔ع۔ت)

حافظ عبدالرزاق ایم اے اسلامیات

خدایا ایں کرم بارِ دگر کن

مسجد الفتح

اسلام کو مٹانے کے لئے قریش مکہ نے یہود مدینہ کی سازش سے ۵ھ میں مدینہ پر حملہ کیا دس ہزار کا لشکر لے کر مدینہ پر چڑھ آئے حضور اکرمؐ نے مدینہ میں رہ کر مقابلہ کرنے کی تجویز فرمائی چنانچہ مسلمان اس طرح مدینہ میں محصور ہوئے کہ پشت پر جبلِ سلع تھا اور سامنے خندق جبل سلع اب تک موجود ہے خندق کا نشان باقی نہیں۔ اسی پہاڑ پر یہ مسجد موجود ہے جسے مسجدِ الفتح کہتے ہیں صحابہ جب خندق کھودتے تھے تو یہ اشعار پڑھتے جاتے تھے۔

نحن الذین بایعوا محمدا

علی الجہاد ما بقینا أبدا

اور ابن رواحہ یہ اشعار بلند آواز سے پڑھتے:

اللھم لولا انت ما اھتدینا
فلا تصدقنا ولا صلینا
فانزلن سکینۃ علینا
وثبت الاقدام ان لاقینا
ان الاعداء قد بغوا علینا
اذا ارادوا فتنۃ ابینا

اس مسجد میں حضور اکرمؐ نے اللہ کے حضور ہاتھ پھیلا کے دعا کی تھی:

اللھم لک الحمد ھدیتنی من الضلالۃ فلا مکرم لمن اھنت ولا مھین لمن اکرمت ولا مُعز لمن اذللت. ولا مذل لمن اعززت ولا ناصر لمن خذلت، ولا خاذل لمن نصرت ولا معطی لما منعت ولا مانع لما اعطیت، ولا رازق لمن حرمت، ولا حارم لمن رزقت ولا رافع لمن خفضت، ولا خافض لمن رفعت، ولا خارق لمن سترت ولا ساتر لمن خرقت، ولا مقرب لما باعدت ولا مباعد لما قربت۔

اور جب حالات نے شدت اختیار کی اور حضور نے حضرت حذیفہ کو حالات کا جائزہ لینے کے لئے بھیجا تو خود اللہ کے حضور ہاتھ پھیلا دیئے:

یا صریخ المکروبین، ویا مجیب المضطرین ویا کاشف ھمی، و غمی وکربی فقد تری حالی وحال اصحابی۔

تو جبرئیل امین دعا کا جواب لے کر حاضر ہوئے اور کہا ان اللہ سمع دعوتک (اللہ نے آپ کی دعا قبول فرمائی) سبحان اللہ اسباب کے اختیار

کرنے اور اللہ پر توکل کرنے کا کیا حسین امتزاج ہے اس لئے اہلِ دل کا کہنا ہے کہ اس مسجد میں آدمی جائے تو یوں دعا کرے:

اللھم یا صریخ المصرخین والمکروبین و یا غیاث المستغیثین و یا مفرج کرب المکروبین و یا مجیب دعوۃ المضطرین صلّ علی سیدنا محمد وآلہ واصحابہ وسلّم واکشف عنی کربی وغمی وحزنی وھمی کما کشفت عن حبیبک ورسولک صلی اللہ علیہ وسلم کربہٗ وحزنہٗ وھمہٗ وغمہٗ فی ھذا المقام فانا اتشفع الیک بہٖ صلی اللہ علیہ وسلم فی ذالک یا حنان ویامنان ویاذا الجودِ والاحسان۔

اس مسجد کے پاس پاس چار اور مسجدیں ہیں اس لئے آج کل یہ مساجد خمسہ کے نام سے مشہور ہیں۔

یہ پہاڑ اور یہ مساجد جہاں مسلمانوں کی جفاکشی جانبازی، حسنِ تدبیر اور توکل علی اللہ کی گواہی کے انمٹ نشان ہیں وہاں اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ قریش مکہ نے اسلام کو مٹانے کے لئے پہلا مقابلہ مدینہ سے ۱۵۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر کیا، غصہ میں اضافہ ہوا، دوسرا مقابلہ مدینہ سے تین میل کے فاصلے پر اور تیسرا حملہ مسلمانوں کے گھروں میں پہنچ گیا مگر اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد سے ایسی شکست کھائی کہ پھر حملہ کی جرأت نہ کر سکے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفویؐ سے شرار بولہبی

ان حقائق کے باوجود بعض لوگ بڑی ڈھٹائی سے کہہ دیتے ہیں کہ اسلام

بروزِ شمشیر پھیلا بقول اکبر الہ آبادی،

کل تک کہیں گے پھیلی خدائی بزورِ موت

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں سرایا اور غزوات کی مجموعی تعداد ۸۲ ہے اور ان میں جانبین کے مقتولین کی تعداد ۱۰۱۸ ہے یعنی اوسطاً ۱۲ مقتول فی جنگ۔

اس کے مقابلے میں جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کے مقتولین کی تعداد ۳۸۰۰۰۰۰ ہے اس کے باوجود مستشرقین اور ان کی معنوی اولاد بھلا کس منہ سے کہہ سکتی ہے۔ کہ اسلام تلوار سے پھیلا۔

دیتے ہیں طعنۂ اصنام پرستی ہم کو
سجدہ کرتے ہوئے نکلے ہیں جو بت خانے سے

جنت البقیع

سُنا تھا کہ جنت البقیع جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے مسلمانوں کا قبرستان چلا آتا ہے بعض وجوہ کی بنا پر عام زائرین کے لئے بند ہے۔ حسنِ اتفاق دیکھئے آج جمعہ کی وجہ سے اس کا ایک گیٹ کھولا گیا جی چاہا چلیں اپنے اسلاف سے ملاقات کر آئیں اس سے پیشتر دو مرتبہ اسے دیکھ چکے ہیں اب کی بار اس کی حالت بدلی ہوئی ہے نشیبی حصوں میں مٹی بھر کے بالکل ہموار کر دیا گیا ہے اور نئی قبروں کے لئے کافی جگہ بن گئی ہے ممکن ہے اسی مصلحت کے تحت یہ اقدام کیا گیا ہو۔ یہ قبرستان اسلام کی قرن اوّل کی دولت اپنے سینے میں لئے ہوئے ہے

اس میں ایسے حضرات بھی ہیں جنہیں زندگی میں زبان نبویؐ سے جنت کی بشارت مل گئی تھی۔ یوں تو حشر کے میدان میں وزن اعمال کے بعد فیصلہ سنایا جائے گا کہ کون جنتی ہے اور کون جہنمی ہے مگر ان حضرات کا کھاتہ خدائے سریع الحساب کی نگاہ میں ایسا صاف تھا کہ زندگی میں ہی ان کے آخری نتیجہ کا اعلان کر دیا گیا انہیں عشرہ مبشرہ کہتے ہیں یہیں وہ ہستی بھی آرام فرما ہے۔ جس کی دولت شجر اسلام کی آبیاری میں صرف ہوئی جس کا پیسہ بے سہارا مسلمانوں کے لئے عظیم سہارا بنا جس کا مال مجاہدین اسلام کے اسلحہ، رسد اور دیگر ضروریات میں کام آیا۔ جس نے حضرت علی کے نکاح کے لئے سارا خرچ اپنی گرہ سے ادا کیا۔ جس نے مسلمانوں کے لئے میٹھے پانی کا کنواں ۲۰ ہزار درہم میں خرید کر وقف کیا جس نے مسجد نبوی کی توسیع کی جس نے غزوۂ تبوک میں ہزاروں مجاہدین کا سارا خرچ اپنے ذمہ لیا۔ جس نے قحط کے زمانے میں اہل مدینہ میں ایک ہزار اونٹ غلّہ مفت تقسیم کیا اور جس کے پاس اللہ کی امانت صرف جان باقی تھی۔ سو وہ بھی پیش کر دی اور اس انداز سے کہ کئی روز تک محصور رہے سبائیوں نے خورد و نوش کا سامان بھی اندر نہ جانے دیا۔ آخر جمعہ کے روز قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے کہ شقی القلب بلوائیوں نے شہید کر دیا جس کی لاش ۲ دن تک بے گور و کفن پڑی رہی اور کابل سے لیکر مراکش تک کے فرمانروا کے جنازہ کی نماز سترہ آدمیوں نے چھپ چھپا کے پڑھی اور جنت البقیع میں دفن کر دیا۔

اس میں وہ مہاجرین ہیں جنہوں نے نبی کریمؐ کے فرمان پر اسلام کی خاطر گھر بار مال و دولت بیوی بچے چھوڑے اور غریب الوطن ہو کر یہاں آئے اور

اپنے محبوب کے پڑوس میں آرام کرنے کی سعادت نصیب ہوئی اس میں وہ انصار ہیں جنہوں نے اپنے مہاجر بھائیوں کے لئے اپنے محبوب کے کہنے پر ہر قسم کی جانی مالی قربانی پیش کر دی اس میں امہات المومنین یعنی ازواج مطہرات اہل بیت النبوی آرام فرما ہیں یہاں حضور کی اولاد دو بچے اور چار بیٹیاں زینب رقیہ ام کلثوم اور فاطمہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے مدفن ہیں کہاں تک تفصیل بیان کی جائے۔ مختصر یہ ہے اس قبرستان میں اسلام کی ابتدائی تاریخ ثبت کر دی گئی ہے یہاں تہور شجاعت، ایثار استقامت، حیا غیرت، حمیت، تقویٰ، خوفِ الٰہی وغیرہ تمام صفات حسنیٰ مجسم ہو کر زیرِ زمین دفن ہیں ان مردانِ کار کا نام تو کہیں لکھا ہوا نہیں ملتا۔ البتہ نشان کہیں کہیں اِکا دکا موجود ہے ان کے نام و نشان کیوں مٹ گئے یہ تو اسلامی تاریخ کو انمٹ بنا گئے تھے مٹے نہیں مٹائے گئے ہیں کچھ تو "توحید" کے سیلاب میں بہہ گئے۔ کچھ "اتباع سنت" کی آندھیوں کی نذر ہو گئے۔ زندہ قومیں کھود کھود کر اپنی تہذیب کے آثار تلاش کر رہی ہیں اور اپنے زعماء کے کارناموں کو پھیلا پھیلا کر ایک نئی زندگی کی راہ نکال رہی ہیں مگر یہاں اپنے ماضی کو بھلا دینے کا سبق دیا جا رہا ہے۔ اپنے اسلاف کو بھول جانا سکھایا جا رہا ہے۔ جو قومیں اپنے شاندار ماضی سے کٹ جاتی ہیں ان کی حیثیت کٹے ہوئے پتنگ کی ہو جاتی ہے۔ ہوا کا جھونکا جدھر چاہے اڑائے چلا جائے اور جہاں چاہے پٹخ دے۔ اسی اسلاف فراموشی کا اثر ہے کہ بالشت بھر زمین پر بسنے والی محدود قوم پوری عرب دنیا کو آنکھیں دکھا رہی ہے اور انہیں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں

ملتی افسوس کہ اس اجداد فراموشی کی وجہ سے کیا سے کیا بن گئے۔

تھے وہ آبا ہی تمہارے پر تم کیا ہو
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو

یہ قبرستان تو ایک جیتی جاگتی مجسم تبلیغ دین ہے آج اس کی طویل چار دیواری کے ساتھ بڑے بڑے بورڈ لگے ہوتے ان پر مختلف زبانوں میں مہاجرین وانصار کے نام درج ہوتے دین وملت کی خاطر ان کی مالی اور جانی قربانیوں کا خلاصہ درج ہوتا اور نہیں تو کم ازکم عربی اردو اور انگریزی زبانوں میں یہ تحریریں ہوتیں اتباع سنت کے جذبہ کی تسکین کے لئے چلو نشان مٹا دینے نام تو زندہ رکھتے ہر سال لاکھوں آدمی اس مقبرہ کی زیارت کو آتے ہیں وہ اپنے اسلاف کے کارنامے پڑھتے کہیں راکھ کے نیچے دبی ہوئی کوئی چنگاری ہی سلگ پڑتی کسی کا سویا ہوا ضمیر بیدار ہو جاتا کہیں غیرت وحمیت کے جذبات ہی زندہ ہو جاتے کہیں مردہ دلوں میں جان پڑ جاتی افسوس کہ اس اتباع سنت نے کروڑہا روپے لگا کر محلات تعمیر کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا کی، اپنی یادگاریں تعمیر کرنے میں حائل ہونے کی جرأت نہ کی، مگر کون کہے کون سنے اور کون مانے:

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمین پر آسمان نے ہم کو دے مارا

جہاں تک یاد پڑتا ہے علماء سے سنا تھا کہ سنت دو قسم سے ہے ایک فعلی اور دوسری قولی جہاں تک فعلی سنت کا تعلق ہے صحیح مسلم میں طویل

حدیث حضرت عائشہ رضؓ سے مروی ہے کہ حضور رات کو اٹھے، اور بقیع میں گئے ہاتھ اٹھا کر دیر تک دعا کرتے رہے۔

اس کے علاوہ مسلم میں حضرت عائشہ رضؓ کی ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور کا یہ معمول تھا چنانچہ الفاظ میں قالت کلما کان لیلتھا من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یخرج من آخر اللیل الی البقیع .... الخ

ان روایات سے معلوم ہوا کہ زیارت قبور بالخصوص زیارت البقیع حضور کی فعلی سنت ہے جہاں تک قولی سُنت کا تعلق ہے مسلم میں حضرت بریدہ رضؓ سے روایت ہے کہ نھیتکم عن زیارۃ القبور فزوروھا ..... الخ

اور ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ حضور نے فرمایا۔ کنت نھیتکم عن زیارۃ القبور فزوروھا فانھا تزھد فی الدنیا و تذکر الاخرۃ۔

یعنی اتباع سنت کا تقاضا تو یہ تھا کہ دعائے اسلام کی قبور ہوتیں ان کی زیارت کی جاتی تاکہ حضورؐ کے ارشاد کی تعمیل بھی ہوتی اور حضور کے معمول کی اتباع بھی ہوتی مگر یہ عجیب اتباع سُنت ہے کہ ترک سنت بلکہ سُنت کی مخالفت سے اتباع سنت ہو رہی ہے:

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد

اور قومی بقاء اور احیائے اسلام اور ایمان کی تازگی کا تقاضا یہ تھا کہ ان جانثارانِ اسلام کے نام اور مختصر کارنامے جلی حروف میں لکھے ہوتے تاکہ دنیا کے گوشے گوشے سے ہر سال آنے والے مسلمان اپنے شاندار ماضی کی ایک جھلک دیکھ لیتے